مقدمۂ نہج البلاغہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ۔

نہج البلاغہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کا وہ مشہور ترین مجموعہ ہے جسے جناب سید رضیؒ برادر شریف مرتضیٰؒ علم الہدیٰ نے چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں مرتب فرمایا تھا۔ ان کے بعد پانچویں صدی کے پہلے عشرے میں آپ کا انتقال ہوگیا ہے اور نہج البلاغہ کے اندازِ تحریر سے پتہ یہ چلتا ہے کہ انہوں نے طویل جستجو کے ساتھ درمیان میں خالی اوراق چھوڑ کر امیر المومنینؑ کے کلام کو متفرق مقامات سے یکجا کیا تھا جس میں ایک طویل مدت صرف ہوئی ہوگی اور اس میں اضافے کا سلسلہ ان کے آخرِ عمر تک قائم رہا ہوگا، یہاں تک کہ بعض کلام جو کتاب کے یکجا ہونے کے بعد ملا ہے، اس کو تعجیل میں انہوں نے اس مقام کی تلاش کیے بغیر جہاں اسے درج ہونا چاہیے تھا، کسی اور مقام پر شامل کر دیا ہے اور وہاں یہ لکھ دیا ہے کہ یہ کلام کسی اور روایت کے مطابق اس کے پہلے کہیں درج ہوا ہے۔ یہ اندازِ جمع و تالیف خود ایک غیر جانب دار شخص کے لیے یہ پتہ دینے کے واسطے کافی ہے کہ اس میں خود سید رضی کے ملکۂ انشا اور قوتِ تحریر کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ انہوں نے صرف مختلف مقامات سے جمع آوری کر کے امیر المومنینؑ کے کلام کو یکجا کر دینے پر اکتفا کی ہے۔ یہ پاشانی اور پریشانی جسے بحیثیت تالیف کے کتاب کا ایک نقص سمجھنا چاہیے، مقام اعتبار میں اس پر اعتماد پیدا کرنے والا ایک جوہر ہوگیا ہے۔ انہوں نے مختلف نسخوں اور مختلف راویوں کی یادداشت کے مطابق نقل الفاظ میں اتنی احتیاط کی ہے کہ بعض وقت دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہوجاتا ہے کہ اس عبارت کے نقل کرنے سے فائدہ ہی کیا ہوا جبکہ ابھی ابھی ہم ایسی ہی عبارت پڑھ چکے ہیں جیسے ذم اہلِ بصرہ میں اس شہر کے غرقابی کے تذکرے میں اس کی مسجد کا نقشہ کھینچنے میں مختلف عبارات کبھی **نعامة جاثمة** اور کبھی **کجوء جوء طیر فی لجة بحر** اور اس سے ملتے جلتے ہوئے اور الفاظ، یہ اسی طرح کا اہتمام صحتِ نقل میں ہے جیسے موجودہ زمانے میں اکثر کتابوں کی عکسی تصویر شائع کی جاتی ہے جس میں اغلاطِ کتابت تک کی اصلاح نہیں کی جاتی اور صرف حاشیے پر لکھ دیا جاتا ہے کہ بظاہر یہ لفظ غلط ہے، صحیح اس طرح ہونا چاہیے۔ دیکھنے والے کا دل تو ایسے مقام پر یہ چاہتا ہے کہ اصل عبارت ہی میں غلط کو کاٹ کر صحیح لفظ لکھ دی گئی ہوتی، مگر صحتِ نقل کے اظہار کے لیے یہ صورت اختیار کی جایا کرتی ہے جیسے قرآن مجید میں بعض جگہ تالیفِ عثمانی کے کاتب نے جو کتابت کی غلطیاں کر دی تھیں جیسے **لا ذبحنه** میں **لا** کے بعد ایک الف جو یقیناً غلط ہے، اس لیے کہ یہ لائے نافیہ نہیں جس کے بعد **اذبحنه** فعل آئے بلکہ لام تاکید ہے جس سے **اذبحنه** فعل متصل ہے، مگر اس قسم کے اغلاط کو بھی دور کرنا بعد کے مسلمانوں نے صحتِ نقل کے خلاف سمجھا۔ اسی طرح املائے

قرآن گویا ایک تعبدی شکل سے معین ہوگیا۔ بعض جگہ رحمۃ کی ت لمبی لکھی جاتی ہے، بعض جگہ جنّٰت بغیر الف کے لکھا جاتا ہے۔ بعض جگہ یدعوا ایسے فعلِ واحد میں بھی وہ الف لکھا ہوا ہے کہ جو جمع کے بعد غیر ملفوظی ہونے کے باوجود لکھا جایا کرتا ہے۔ ان سب خصوصیات کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے جس سے مقصود وثاقتِ نقل میں قوت پیدا کرنا ہے۔ اسی طرح علامہ سید رضی نے جس شکل میں جو فقرہ دیکھا، اس کو درج کرنا ضروری سمجھا تاکہ کسی قسم کا تصرف کلام میں ہونے نہ پائے۔ یہ ایک روایتی پہلو ہے جو اس تصور کو بالکل ختم کر دیتا ہے کہ یہ کتاب سید رضی رحمۃ اللہ کی تصنیف کی حیثیت رکھتی ہو۔

دوسرا پہلو خطبوں کے درمیان کے ومنا۔۔۔۔ ومنہ ہیں جس میں عموماً بعد کا حصہ قبل سے بالکل غیر مربوط ہوتا ہے، بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قبل کا حصہ قبل بعثت سے متعلق ہے یا اوائل بعثت سے اور بعد کا حصہ بعدِ وفاتِ رسولؐ سے متعلق ہے۔ یہ بھی دیکھنے والے کے ذوق پر بار ہو جایا کرتا ہے، مگر اس سے بھی اس مقصد کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اگر سید رضی کا کلام ہوتا تو فطری طور پر اس میں تسلسل ہوتا یا اگر انہیں دو موضوعوں پر لکھنا ہوتا تو اسے وہ دو خطبوں میں مستقل طور پر تحریر کرتے، لیکن وہ کیا کرتے جب کہ انہیں کلام امیر المومنینؑ ہی کا انتخاب پیش کرنا تھا اس لیے جہاں خطبے کا پہلا جز اور آخر کا جز دو مختلف موضوعوں سے متعلق ہے اور درمیان کا حصہ کسی وجہ سے وہ درج نہیں کر رہے ہیں تو نہ وہ اس کو کلامِ واحد بنا سکتے ہیں، نہ مستقل دو خطبے، بلکہ انہیں ایک ہی کلام میں ومنہا کے فاصلے قائم کرنا پڑتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ شکل بعض جگہ تو انتخاب کی وجہ سے ہوئی ہے اور بعض جگہ یہ بھی وجہ ہوسکتی ہے کہ سابق میں قلمی کتابوں کے سوا کوئی دوسری شکل مواد کے فراہم ہونے کی نہ ہوتی تھی اور قلمی کتابوں کے اکثر نسخے منحصر بفرد ہوتے تھے اب اگر ان میں درمیان کا حصہ کرم خوردہ ہوگیا ہے یا اوراق ضائع ہوگئے ہیں یا رطوبت سے روشنائی پھیل جانے کی وجہ سے وہ ناقابلِ قرأت ہے تو علامہ سید رضی اس موقع پر درمیان کا حصہ نقل کرنے سے قاصر رہے ہیں اور حرصِ جمع وحفاظت میں انھوں نے اس کے قبل یا بعد یا وسط کے وہ سطور تلاش کیے ہیں جو کسی مستقل مفاد کے حامل ہیں اور اس طرح درمیان کے حصوں میں انھوں نے ومنہا کہہ کر اس کے درج کرنے سے عاجزی ظاہر کی ہے۔ یہ بھی ہے کہ اس وقت علم کا ایک بڑا ذخیرہ حفاظ و ادباء محدثین کے سینوں میں ہوتا تھا۔ فرض کیجئے کسی اپنے استاد اور شیخ حدیث سے علامہ سید رضی نے کسی موقع کی مناسبت سے خطبے کا ابتدائی حصہ سن لیا اور انہوں نے اسے فوراً قلم بند کرلیا، پھر دوسرے موقع پر انہوں نے ان کی زبان سے اسی خطبے کے کچھ دوسرے فقرات سنے اور انہیں محفوظ کرلیا اور اتنا موقع نہ مل سکا کہ درمیانی اجزا ان سے دریافت کر کے لکھتے۔ اس طرح انہوں نے اس کی خانہ پری ومنہا کے ذریعے سے کی۔ یہ بھی اس کی دلیل قوی ہے کہ انہوں نے اصل کلام امیر المومنینؑ کے ضبط وحفظ ہی کی کوشش کی ہے، قطعاً کوئی تصرف خود نہیں کرنا چاہا۔

تیسرا شاہد اس کا خود جناب رضی کے وہ مختصر تبصرے ہیں جو کہیں کہیں کچھ خطبوں کے بعد انہوں نے اس کلام کے متعلق اپنے احساسات وتاثرات کے اظہار پر مشتمل درج کر دیے ہیں یا بعض جگہ کچھ الفاظ کی تشریح ضروری سمجھی ہے۔ ان تبصروں کی عبارت نے ان خطبوں سے متصل ہو کر ہر صاحبِ ذوق عربی داں کے لیے یہ اندازہ قطعی طور پر آسان کر دیا ہے کہ ان تبصروں کا انشاء پرداز وہ ہرگز نہیں ہوسکتا جو ان خطبوں کا انشا پرداز ہے، جس طرح خود علامۂ رضی نے اپنی مایۂ ناز تفسیر حقائق التنزیل میں اعجازِ قرآن کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ باوجود یکہ امیر المومنینؑ کا کلام جو فصاحت وبلاغت میں مافوق البشر ہے، مگر جب خود حضرت کے کلام میں کوئی قرآن کی آیت آجاتی ہے تو وہ اس طرح چمکتی ہے جس طرح سنگ ریزوں میں گوہرِ شاہ وار۔ بالکل اسی شکل سے اگرچہ علامہ سید رضی اپنے دور کے افصحِ زمانہ تھے اور ادبِ عربی میں معراجِ کمال پر فائز تھے، مگر نہج البلاغہ

میں امیر المومنینؑ کے کلام کے بعد جب ان کی عبارت آجاتی ہے تو ہر دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ اس کی نگاہ بلندیوں سے گر کر نشیب میں پہنچ چکی ہے، حالانکہ ان عبارتوں میں علامہ سید رضی نے ادبیت صرف کی ہے اور اپنی حد بھر اپنی قابلیت دکھائی ہے، مگر سابق کلام کی بلندی کو ہر مطالعہ کرنے والے کے لیے ایک امرِ محسوس کی حیثیت سے ظاہر کر دیا، یہ بھی ایک بہت بڑا داخلی شاہد ہے۔ اس تصور کے غلط ہونے کا وہ علامہ سید رضی کا کلام ہو۔

چوتھا امر یہ ہے کہ جناب سید رضی اپنے دور کے کوئی گمنام شخص نہ تھے۔ وہ دینی و دنیوی، دونوں قسم کے ذمے دار منصبوں پر فائز تھے۔ یہ دور بھی وہ تھا جو مذہب وملت کے علماء وفضلا سے بھرا ہوا تھا۔ بغداد سلطنت عباسیہ کا دار السلطنت ہونے کی وجہ سے مرکزِ علم وادب بھی تھا۔ خود سید رضی کے استاد شیخ مفید بھی نہج البلاغہ کے جمع وتالیف کے دور میں موجود تھے، اس لیے کہ جناب شیخ مفید علامہ سید رضی کی وفات کے بعد تک موجود رہے ہیں اور شاگرد کا انتقال استاد کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اور معاصرین کو تو ایک شخص کے متعلق الزامات کی تلاش رہتی ہے۔ پھر شریف رضی سے تو خود حکومتِ وقت کو بھی مخاصمت پیدا ہو چکی تھی۔ اس محضر پر دستخط نہ کرنے کی وجہ سے جو فاطمیینِ مصر کے خلاف حکومت نے مرتب کیا تھا اور جس پر علامہ رضی کے بڑے بھائی اور ان کے والدِ بزرگوار تک نے حکومت کے تشدد کی بنا پر دستخط کر دیے تھے، مگر علامہ سید رضی نے عواقب ونتائج سے بے نیاز ہو کر اس پر دستخط سے انکار کر دیا تھا۔ علاوہ اس کے کہ اس کردار کا شخص جو صداقت کو ایسے قوی ترین محرکات کے خلاف محفوظ رکھے، اس طرح کی چھچھوری بات کر ہی نہیں سکتا کہ وہ ایک پوری کتاب خود لکھ کر امیر المومنینؑ کی جانب منسوب کر دے جس کا غلط ہونا علمائے عصر سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، اور اگر بالفرض وہ ایسا کرتے بھی تو ان کے دور میں ان کے کلام علمائے وقت اور ارکانِ حکومت کی طرف سے اس الزام کو شدت سے اچھالا جاتا اور سخت سے سخت نکتہ چینی کی جاتی، حالانکہ ہمارے سامنے خود ان کے عصر کے علماء کی کتابیں اور ان کے بعد کے کئی صدی تک کے مصنفین کے تحریرات موجود ہیں۔ ان میں سے کسی میں کمزور سے کمزور طریقے پر بھی ان کے حالاتِ زندگی میں اس قسم کے الزام کا عائد کیا جانا یا اس بارے میں ان پر کسی قسم کی نکتہ چینی کا ہونا موجود نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صرف بر بنائے جذبات نہج البلاغہ کے بعض مندرجات کو اپنے معتقدات کے خلاف پا کر کچھ متعصب افراد کی بعد کی کارستانی ہے جو انہوں نے نہج البلاغہ کو کلام سید رضی قرار دینے کی کوشش کی ہے، ورنہ خود جناب سید رضی اعلی اللہ مقامہٗ کے دور میں اس کے مندرجات کا کلامِ امیر المومنینؑ ہونا بلا تفریقِ فرقہ ومذہب ایک مسلم چیز تھی اور اسی لیے اس بارے میں کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکا۔

پانچواں امر یہ ہے کہ سید رضی اعلی اللہ مقامہٗ کے قبل ایسا نہیں ہے کہ امیر المومنینؑ کے خطبوں کا کوئی نام ونشان عالم اسلام میں نہ پایا جاتا ہو، بلکہ کتبِ تاریخ وادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک مسلم الثبوت ذخیرہ بحیثیتِ خطب امیر المومنین علیہ السلام کے سید رضی رحمہ اللہ کے قبل سے موجود تھا۔ چنانچہ مؤرخ مسعودی نے جو علامہ سید رضیؒ سے مقدم طبقے میں ہیں، بلکہ ان کی ولادت کے قبل وفات پا چکے تھے، اس لیے کہ علامہ سید رضیؒ کا دورِ شباب ہی میں ۴۰۶ ہجری میں انتقال ہوا ہے اور مسعودی کی وفات ۳۴۰ ہجری میں ہو چکی تھی۔ جس وقت سید رضی کے استاد شیخ مفید ہی نہیں بلکہ ان کے بھی استاد شیخ صدوق محمد بن علی ابن بابویہ قمی بھی زندہ تھے، مسعودی نے اپنی تاریخ مروج الذہب میں لکھا ہے کہ:۔

والذی حفظ الناس عنه من خطبه فی سآئر مقاماته اربعمائة خطبة ونیف وثمانون خطبة یوردها علی البدیهة تداول الناس ذالك عنه قولاً و عملاً۔

(مروج الذہب، جلد ۲، ص ۳۳، طبع مصر)

لوگوں نے آپ (حضرتِ علی ابنِ ابی طالبؑ) کے جو خطبے مختلف موقعوں کے محفوظ کر لیے ہیں، وہ چار سو اسی سے کچھ زیادہ تعداد میں ہیں جنھیں آپ نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا تھا، جنھیں

لوگوں نے نقلِ قول کے طور پر بھی بتواتر نقل کیا ہے اور اپنے خطب و مضامین میں ان کے اقتباسات وغیرہ سے بکثرت کام بھی لیتے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ چار سو اسی سے کچھ اوپر خطبے اگر تمام و کمال یک جا کیے جائیں تو بلا شبہ نہج البلاغہ سے بڑی کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ جب یہ اتنا بڑا ذخیرہ سید رضیؒ کی ولادت سے پہلے سے موجود تھا تو پھر علامہ سید رضی کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ اس ذخیرے سے کام نہ لیں اور اپنی طرف سے نہج البلاغہ ایسی کتاب کو تحریر کر دیں۔ ایسا اس شخص کے لیے کیا جاتا ہے جو گمنام ہو اور جس کا کارنامہ کوئی موجود نہ ہو اور اس کے اخلاف یا منتسبین خواہ مخواہ اس کو نمایاں بنانے کے لیے اس کی جانب سے کوئی کارنامہ تصنیف کر دیں۔ صرف علامہ مسعودی کا یہ قول ہی اس ذخیرہ کے ثبوت کے لئے کافی تھا جب کہ اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ذخیرہ آثار قدیمہ کے طور پر کسی دور و دراز عجائب خانے یا کسی ایک عالم کے متروکات میں شامل نہیں تھا جس تک رسائی کسی زحمت کی طلب گار ہوتی ہو، بلکہ **حفظ الناس** اور **تداول الناس** کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ عموماً اہلِ علم کے ہاتھوں میں موجود اور متداول تھا۔ اس کے علاوہ دورِ عباسیہ کے یگانۂ روزگار کاتبِ عبدالحمید بن یحییٰ، متوفی ۱۳۲ھ کا یہ مقولہ علامہ ابنِ ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں درج کیا ہے کہ

حفظت سبعین خطبة من خطب الاصلح ففاضت ثم فاضت۔

میں نے ستر خطبے علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کے ازبر کیے ہیں جن کے فیوض و برکات میرے یہاں نمایاں ہیں۔

اس کے بعد ابن المقفع، متوفی ۱۴۲ھ کا اعتراف ہے جسے علامہ حسن الذوبی نے اپنے ان حواشی میں جو **کتاب البیان والتبیین للجاحظ** پر لکھے ہیں، وہ ابنِ مقفع کے بارے میں لکھتے ہیں:

الظاهر انه تخرج فی البلاغة علی خطب الامام علی ولذلك كان يقول شربت من الخطب من ريا ولم اضبط لها رويا ففاضت ثم فاضت۔

غالباً ابن المقفع نے بلاغت میں امیر المومنینؑ علی ابن ابی طالبؑ کے خطبوں سے استفادہ کیا تھا اور اسی بنا پر وہ کہتے تھے کہ میں نے خطبوں کے چشمے سے سیراب ہو کر پیا ہے اور اسے کسی ایک طریقے میں محدود نہیں رکھا ہے تو اس چشمے کے برکات بڑھے اور ہمیشہ بڑھتے رہے۔

اس کے بعد ابنِ نباتہ، متوفی ۳۷۴ھ یہ بھی سید رضی سے مقدم ہیں اور ان کا یہ قول ہے:

حفظت من الخطابة كنزا لايزيده الانفاق الاسعة و كثرة حفظت ماته فصل من مواعظ علی ابن ابی طالب۔

میں نے خطابت کا ایک خزانہ محفوظ کیا ہے جس سے جتنا زیادہ کام لیا جائے، پھر بھی اس میں برکت زیادہ ہی ہوتی رہے گی۔ میں نے سو فصلیں علی ابنِ ابی طالبؑ کے مواعظ میں سے یاد کی ہیں۔

ابنِ نباتہ کے اس قول کا بھی ابن ابی الحدید نے تذکرہ کیا ہے۔

رجال کشی میں ابو الصباح کنانی کے حالات میں لکھا ہے کہ زید ابنِ علی ابن الحسین جو زید شہید کے نام سے مشہور ہیں اور جن کی شہادت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانۂ امامت میں ہوئی، وہ برابر امیر المومنینؑ کے خطبوں کو سنا کرتے تھے۔

ابو الصباح کہتے ہیں: **كان يسمع منی خطب امیر المومنین علیه السلام۔** یہ دوسری صدی ہجری کا ذکر ہے اور اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ایک ذخیرہ خطبوں کا اس وقت بھی موجود تھا جو مسلم طور پر حضرتِ علیؑ ابنِ ابی طالب علیہ السلام کی طرف نسبت رکھتا تھا۔

ان تمام مقامات پر بطورِ ارسال مسلمات خطب علیؑ کہنا بتاتا ہے کہ اس زمانے میں اس بارے میں کوئی شک و شبہ بھی محسوس نہیں کیا جاتا تھا، ورنہ جیسا کئی صدی بعد جب کچھ اغراض

کی بنا پر مصنفین نے اس حقیقت کو مشکوک بنانا ضروری سمجھا تو **المنسوبة الی علی** کہنے لگے۔ دورِاول میں اس قسم کے شک وشبہ کے اظہار کرنے والی کوئی لفظ پائی نہیں جاتی۔

رجال کبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ زید ابن وہب جہنی متوفی حدود ۹۰ھ نے، جو خود حضرت امیرالمومنینؑ کے رواۃ احادیث میں سے ہیں، آپ کے خطبوں کو جمع کیا تھا اور اس کے بعد اور متعدد افراد ہیں جنھوں نے سید رضیؒ کے پہلے حضرت کے خطب واقوال کو جمع کیا، جیسے:

(۱) ہشام ابن محمد ابن سائب کلبی، متوفی ۱۴۶ھ۔ ان کے جمع و تالیف کا ذکر فہرست ابن ندیم، جزو ۷، صفحہ ۲۵۱ میں موجود ہے۔

(۲) ابراہیم ابن ظہیر فرازی۔ ان کا ذکر فہرستِ طوسی میں یوں ہے: **صنف کتباً منها کتاب الملاحم و کتاب خطب علی علیه السلام۔**

متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ منجملہ ان کے کتاب الملاحم اور کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

اور رجال نجاشی میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

(۳) ابومحمد مسعدہ ابن صدقہ عبدی۔ ان کے متعلق رجال نجاشی میں ہے: **له کتب منها کتاب خطب امیر المومنین علیه السلام۔**

ان کے متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے ایک کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

(۴) ابوالقاسم عبدالعظیم ابنِ عبداللہ حسنی جن کا مزار طہران سے تھوڑے فاصلے پر شاہ عبدالعظیم کے نام سے مشہور ہے۔ یہ امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔ ان کے جمع کردہ خطبوں کا ذکر رجال نجاشی میں اس طرح ہے: **له کتاب خطب امیرالمومنین علیه السلام۔** ان کی ایک کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

(۵) ابوالخیر صالح ابن ابی حماد رازی۔ یہ بھی امام علی نقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے ہیں۔ نجاشی میں ہے:

له کتب منها کتاب خطب امیر المومنین علیه السلام۔

منجملہ آپ کی تالیفات کے کتاب خطب علی علیہ السلام ہے۔

(۶) علی ابن محمد ابنِ عبداللہ مدائنی، متوفی ۲۲۵ھ۔ انہوں نے حضرت کے خطبوں اور ان مکاتیب کو جمع کیا جو حضرت نے اپنے عمال کو تحریر فرمائے تھے۔ اس کا ذکر معجم الادبا یاقوت حموی، جزو ۵، صفحہ ۳۱۳ میں ہے۔

(۷) ابومحمد عبدالعزیز جلودی بصری، متوفی ۳۳۰ھ کے تصانیف میں کتاب خطب علیؑ، کتاب رسائل، کتاب مواعظِ علیؑ، کتاب خطب علی علیہ السلام فی الملاحم کتاب دعائے علیؑ موجود ہیں جن کا تذکرہ شیخ طوسی نے فہرست میں اور نجاشی نے ان کے طویل تصنیفات کے ذیل میں اپنے رجال میں کیا ہے۔

(۸) ابومحمد حسن ابن علی ابن شعبۂ حلبی، متوفی ۳۲۰ھ نے اپنی مشہور کتاب تحف العقول (صفحہ ۱۳، طبع ایران) میں امیرالمومنینؑ کے کچھ کلماتِ امثال اور خطب کو درج کرنے کے بعد لکھا ہے:

اننا لو استغرقنا جمیع ما وصل الینا من خطبه و کلامه فی التوحید خاصة دون ما سواه من المعانی لکان مثل جمیع هذا الکتاب۔

اگر ہم وہ سب لکھنا چاہیں جو ہم نے حضرت کے خطبے اور آپ کا کلام صرف توحید کے بارے میں پہنچا ہے علاوہ دوسرے موضوعات کے، تو وہ پوری اس کتاب (تحف العقول) کے برابر ہوگا۔

اب مذکورۂ بالا تفصیل پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی میں زید ابن وہب جہنی نے حضرت کے خطبوں کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا۔ دوسری صدی میں عبدالحمید ابن یحییٰ کاتب اور ابن مقفع کے دور میں وہ ذخیرہ مسلم طور پر موجود تھا اور اس صدی کے وسطی دور میں وہ خطبے پڑھے اور سنے جاتے تھے جیسا

کہ زید شہید کے واقعے سے ظاہر ہوا، اور ادبا اس کو زبانی حفظ کرتے تھے جیسا کہ عبدالحمید اور ابن مقفع کے تصریحات سے ظاہر ہوا۔ اور تیسری صدی میں متعدد مصنفین نے جو جو خطبے ان تک پہنچے تھے، ان کو مدون کیا۔ ایسی صورت میں جناب سید رضیؒ کو اس کی ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ ان تمام ذخیروں کو نظرانداز کر کے یہ دماغی کاوش و کاہش گوارا کریں کہ وہ از خود کلام امیرالمومنینؑ کے نام سے کوئی چیز تصنیف کریں۔

چھٹا امر یہ ہے کہ ان تمام ذخیروں کے سابق سے موجود ہونے کے بعد ظاہر ہے کہ علامہ سید رضیؒ کے لیے یہ قطعی ممکن نہیں تھا کہ وہ ان تمام ذخائر کو تلف کرا دیتے اور پھر اسی کی ترویج کرتے جو انھوں نے کلام امیرالمومنینؑ قرار دیا تھا۔ یہ قطعی ناممکن تھا۔ اگر وہ ذخیرہ کسی ایک مصنف کے پاس کسی ایک دور دراز جگہ ہوتا، تو یہ امکان بھی تھا جیسا کہ مشہور ہے کہ شیخ ابوعلی سینا نے فارابی کے تمام مصنفات کو کسی شخص سے حاصل کر کے انھیں تلف کر دیا اور ان چیزوں کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔ یہاں یہ صورت قطعاً ناممکن تھی جبکہ وہ کلام ادبا کے سینوں میں محفوظ تھا۔ اطراف و اقطارِ عالمِ اسلامی میں منتشر تھا اور بہت سے مصنفین اس کی تدوین کر چکے تھے، پھر جب کہ سید رضیؒ کی تصنیف کے ساتھ ان ذخائر کا موجود ہونا لازمی تھا تو اگر سید رضیؒ کا جمع کردہ کلام اس ذخیرے سے مختلف ہوتا یا اسلوبِ بیان میں اس سے جدا ہوتا تو وہ تمام ادبائے زمانہ، خطبائے روزگار، علمائے وقت جو اس کلام کو دیکھتے ہوئے، پڑھے ہوئے یا یاد کیے ہوئے تھے، صدائے احتجاج بلند کر دیتے، ان میں تلاطم ہو جاتا اور سید رضیؒ تمام دنیا میں اس کی وجہ سے بدنام ہو جاتے۔ کم از کم کوئی ان کے ہم عصر ادبا میں سے اس کی تنقید ہی کرتا ہوا ایک کتاب ہی اسی موضوع پر لکھ دیتا کہ امیرالمومنینؑ کا جو کلام اب تک محفوظ رہا، یہ سید رضی کے جمع کیے ہوئے ذخیرے سے مختلف ہے، خصوصاً جب وہ وجہ جو بعد میں ایک طبقے کو اس باب میں انکار یا تشکیک کی موجب ہوئی جس کی تفصیل کسی حد تک آئندہ درج ہوگی۔ وہ ایک مذہبی بنیاد تھی، یعنی یہ کہ نہج البلاغہ میں ان افراد کے بارے میں جنھیں سوادِ اعظم قابلِ احترام سمجھتا ہے، کچھ تعریضات یا انتقادی کلمات ہیں۔

ظاہر ہے کہ نہج البلاغہ سلطنتِ عباسیہ کے دارالسلطنت میں لکھی گئی جو اہلِ سنت کا علمی مرکز تھا۔ اس وقت بڑے بڑے علماء، حفاظ، ادباء، خطبا، اہلِ سیر اور محدثین، اہلِ سنت میں موجود تھے اور ان کا جمِ غفیر خاص بغداد میں موجود تھا۔ اگر امیرالمومنینؑ کے وہ خطبات جو ابن المقفع، ابن نباتہ، عبدالحمید ابن یحییٰ، جاحظ اور دیگر مسلم الثبوت ادبا کے دور میں موجود تھے، ان تعریضات سے خالی تھے اور اس قسم کے مضامین ان میں نہ تھے، بلکہ فطری طور پر اس صورت میں اس کے خلاف چیزوں پر انھیں مشتمل ہونا چاہیے تھا تو اس وقت کے اہلِ سنت کے علماء اس پر قیامت برپا کر دیتے اور اس کو اپنے مذہب کے خلاف ایک عظیم حملہ تصور کر کے پورے طور سے اس کا مقابلہ کرتے اور اس کی دھجیاں اڑا دیتے، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا، کوئی دھیمی سی آواز بھی اس کے خلاف بلند نہیں ہوئی۔ یہ اس کا قطعی ثبوت ہے کہ سید رضیؒ کے جمع کردہ مجموعے میں کوئی نئی چیز نہ تھی بلکہ وہ وہی تھا جو اس کے پہلے مضبوط و مدون، متداول و محفوظ رہا تھا، علماء قطعاً اس سے اجنبیت نہ رکھتے تھے بلکہ اس سے مانوس اور اس کے سننے کے اور یاد کرنے کے عادی تھے۔ وہ اس ادبی ذخیرے کو اس کی ادبی افادیت کے اعتبار سے سر آنکھوں پر رکھتے تھے اور اس تنگ نظری میں مبتلا نہ تھے کہ چونکہ اس میں کچھ چیزیں ہمارے مذہب کے خلاف ہیں اس لیے اس کا انکار کیا جائے یا اس سے اجنبیت برتی جائے۔

ساتواں امر یہ ہے کہ بہت سی کتابیں علامہ سید رضیؒ کے قبل کی اس وقت بھی ایسی موجود ہیں جن میں امیرالمومنینؑ کے اکثر مواقع کے کلام یا خطبات کو کسی مناسبت سے ذکر کیا ہے، جیسے جاحظ، متوفی ۲۵۵ھ کی البیان والتبیین، ابن قتیبہ دینوری، متوفی ۲۷۶ھ کی عیون الاخبار و غریب الحدیث، ابن واضح یعقوبی، متوفی ۲۷۸ھ کی مشہور تاریخ، ابوحنیفہ دینوری، متوفی ۲۸۰ھ کی اخبار الطوال، ابوالعباس

المبرد، متوفی ۲۸۶ھ کی کتاب المبرد مشہور مورخ ابن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ کی تاریخ کبیر، ابن درید، متوفی ۳۲۱ھ کی کتاب المجتنی، ابن عبدربہ، متوفی ۳۲۸ھ کی عقد الفرید، ثقۃ الاسلام کلینی، متوفی ۳۲۹ھ کی مشہور کتاب کافی، مسعودی متوفی ۳۴۶ھ کی تاریخ مروج الذہب، ابوالفرج اصفہانی، متوفی ۳۵۶ھ کی کتاب اغانی، ابوعلی قالی، متوفی ۳۵۶ھ کی کتاب النوادر، شیخ صدوق متوفی ۳۸۱ھ کی کتاب التوحید اوران کے دوسرے جوامع حدیث، شیخ مفید رحمہ اللہ متوفی ۴۱۶ھ اگرچہ تاریخ وفات کے اعتبار سے جناب رضیؒ سے مؤخر ہیں، مگر ان کے استاد ہونے کی وجہ سے طبقۃً مقدم ہیں۔ ان کی کتاب الارشاد اور کتاب الجمل۔ ان تمام کتابوں میں جو حضرتؑ کے خطبے درج ہیں، ان کا جب مقابلہ علامہ سید رضیؒ کے مندرجہ خطب اور اجزائے کلام سے کیا جاتا ہے تو اکثر تو وہ بالکل متحد ہوتے ہیں۔ اور نہج البلاغہ میں ایسا درج شدہ کلام اگر کوئی ہے جو ان کتابوں میں درج نہیں ہے یا ان کتابوں میں کوئی کلام ایسا ہے جو نہج البلاغہ میں مذکور نہیں ہے تو اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام، تسلسل و بلند آہنگی، جوش و حقائق نگاری کے لحاظ سے یقیناً متحد ہوتا ہے جس میں کسی واقفِ عربیت کو شک نہیں ہوسکتا۔ امیر المومنینؑ کے اس کلام کا جو نہج البلاغہ میں درج ہے، اس تمام کلام سے جو حضرت کی طرف نسبت دے کر اور دوسری کتابوں میں درج ہے، متحد الاسلوب ہونا، پھر اس پہلو کے ضمیمے کے ساتھ جس کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے کہ وہ خود سید رضیؒ کے اس کلام سے جو نہج البلاغہ میں بطورِ مقدمہ یا بطورِ تبصرہ موجود ہے۔ بالکل مختلف ہونا ایک غیر جانب دار شخص کے لیے اس کا کافی ثبوت ہے کہ یہ واقعی امیر المومنینؑ ہی کا کلام ہے جسے علامہ سید رضیؒ نے صرف جمع کیا ہے۔

آٹھواں امر یہ ہے کہ خود علامہ سید رضیؒ کے معاصرین یا ان سے قریب العہد متعدد لوگوں نے بطورِ خود بھی کلام امیر المومنینؑ کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کیا ہے۔ جیسے ابنِ مسکویہ، متوفی ۴۲۱ھ نے تجارب الامم میں، حافظ ابونعیم اصفہانی، متوفی ۴۳۰ھ نے حلیۃ الاولیا میں، شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی، متوفی ۴۶۰ھ نے جو شیخ مفید رحمہ اللہ سے تلمذ کی حیثیت سے علامہ رضی نے ہم طبقہ اور علم الھدیٰ سید مرتضیٰ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے اور نیز سالِ وفات کے اعتبار سے ان سے ذرا موخر ہیں، اپنی کتاب تہذیب اور کتاب الامالی میں، نیز عبدالواحد ابن محمد ابن عبدالواحد آمدی جو اسی عصر کے تھے، اپنی مستقل کتاب غرر الحکم و درر الکلم جو امیر المومنینؑ کے مختصر کلمات پر مشتمل ہے اور مصر و صیدا اور ہندوستان میں طبع ہو چکی ہے اور اس کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے، نیز ابوسعید منصور ابن حسین آبی وزیر، متوفی ۴۲۲ھ اپنی کتاب نزہۃ الادب و نثر الدرر میں جس کا ذکر کشف الظنون، باب النون میں ہے اور قاضی ابوعبداللہ محمد بن سلامہ قطاعی شافعی، متوفی ۴۵۳ھ جن کی عظیم الشان کتاب اس موضوع پر دستور معالم الحکم کے نام سے ہے اور وہ مصر میں طبع ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ یہ سب تقریباً سید رضیؒ کے معاصرین ہی ہیں۔ ان سب کی کاوشیں ہمارے سامنے موجود ہیں سوائے ابوسعید منصور کی کتاب کے جس کا کشف الظنون میں تذکرہ ہے۔ باقی یہ سب کتابیں مطبوع و متداول ہیں۔ ان میں جو کلام مندرج ہے، وہ بھی علامہ سید رضیؒ کے درج کردہ کلام سے عیناً متحد یا اسلوب میں متفق ہی ہے۔ پھر اگر سید رضیؒ کی نسبت یہ تصور کیا جائے کہ انھوں نے خود اس کلام کو تصنیف کر دیا ہے تو ان تمام جامعین اور اپنی کتابوں کے ضمن میں درج کرنے والے دوسرے افراد کو کیا کہا جائے گا؟ پھر ان کی نسبت بھی یہی تصور کرنا چاہیئے، جبکہ ان میں سے سب یا زیادہ افراد یقیناً جلالت شان اور ورع و تقویٰ وغیرہ میں علامہ سید رضیؒ سے بالاتر نہیں معلوم ہوتے۔ اب اگر ان سب کی نسبت یہی خیال کیا جائے تو خیر علامہ سید رضیؒ تو اشعر الطالبین تھے اور کتبِ سیر انھیں خود ادبیت اور فصاحت و بلاغت میں معراجِ کمال پر ظاہر کرتے ہیں، مگر ان میں سے ہر شخص کی نسبت تو یہ تصور قطعی غلط ہے کہ وہ سب علامہ سید رضی ہی کے ادبی حیثیت سے ہم پایہ تھے، پھر ایسے مختلف المرتبہ اشخاص کی ذہنی کاوشوں اور قلمی ثمرات میں اتنا ہی فرق کیوں نہیں ہے جو خود ان اشخاص کے مبلغِ علمی میں یقینی طور پر پایا جاتا ہے۔

اشخاص کہ جو کلام کے جمع کرنے والے ہیں، ان میں آپس میں زمین و آسمان کا فرق اور کلام جو انھوں نے جمع کیا ہے، وہ سب ایک ہی مرتبے، ایک ہی شان کا۔ اسے دیکھتے ہوئے سوائے ایسے شخص کے جو جان بوجھ کر حقیقت کے انکار کرنے پر تلا ہوا ہو اور کسی کو اس میں شک وشبہ بھی باقی نہیں رہ سکتا کہ ان اشخاص کا کارنامہ صرف جمع وتالیف ہی ہے جس میں ان کے سلیقے اور ذوق کا اختلاف فقط شانِ ترتیب اور عنوانِ تالیف میں نمودار ہوتا ہے، لیکن اصل کلام میں ان کی ذاتی قابلیت، ذہانت اور مبلغِ علمی اور معیارِ ادبی کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔

نواں امر یہ ہے کہ مذکورۂ بالا افراد اگر چہ اپنے زمانۂ حیات کے کچھ حصوں میں علامہ سید رضیؒ سے متحد ہیں، مگر ان میں سے متعدد افراد کے سالِ وفات کو دیکھتے ہوئے یہ یقین ہے کہ ان کا زمانہ جمع وتالیف نہج البلاغہ سے مؤخر ہے اور اس کے بعد ایک ایسا طبقہ ہے جو بالکل علامہ رضیؒ سے مؤخر ہی ہے جیسے ابن ابی الحدید، متوفی ۶۵۵ھ، سبط ابن جوزی، متوفی ۶۰۶ھ اور اس کے بعد بہت سے مصنفین۔ ظاہر ہے کہ علامہ رضیؒ کی کتاب نہج البلاغہ گوشۂ گمنامی میں اور ان لوگوں سے مخفی نہ تھی۔ ان لوگوں کا محرک اس جمع وتالیف پر صرف یہ تھا کہ علامہ سید رضیؒ نے انتخاب سے کام لیتے ہوئے یا ماخذوں کی کمی سے یا ان نسخوں کے کرم خوردہ یا ناقص ہونے کی وجہ سے، جو ان کے پاس تھے، بہت سے اجزائے کلام امیرالمومنینؑ کے نقل نہیں بھی کیے تھے، اس لیے مصنفین کو مستدرک اور مستدرک در مستدرک کی ضرورت پڑتی رہی جس کا سلسلہ ماضیِ قریب میں علامہ شیخ ہادی آل کاشف الغطا تک جاری رہا جنھوں نے مستدرک نہج البلاغہ تحریر فرمایا جو نجفِ اشرف میں طبع ہو چکا ہے اگر علامہ سید رضیؒ کے قریب العہد یا ان کے بعد کے اہلِ قلم میں کسی کو بھی نہج البلاغہ کے مندرجہ کلمات و خطب میں یہ خیال ہوتا کہ یہ جناب سید رضیؒ نے تصنیف کر کے اس میں شامل کر دیے ہیں تو وہ سب بالخصوص معاصرین جو کسی رعایت کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتے، اپنی کتابوں کی وجہِ تالیف میں اس کا تذکرہ ضرور سمجھتے کہ چونکہ اس کے قبل جو کتاب امیرالمومنینؑ کے خطبوں پر مشتمل کہہ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں آپ کا اصل کلام موجود نہیں ہے بلکہ وہ ساختہ و پرداختہ اور وضعی ہے، اس لیے ہمیں ضرورت محسوس ہوئی کہ ہم آپ کا اصلی کلام منظرِ عام پر لائیں، جبکہ ایسا نہیں ہوا اور یہ بالکل مشاہدہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ان سب کے نزدیک علامہ سید رضیؒ نے جو کلام جمع کیا، وہ بلاشبہ کلام امیرالمومنینؑ کی حیثیت سے اس کے پہلے سے مدون و متداول تھا اور ان کو سید رضیؒ سے شکایت صرف بعض خطبوں کو چھوڑ دینے یا احاطہ واستقصا نہ کرنے یا شانِ ترتیب وعنوانِ تالیف میں کسی مناسب تر صورت کو اختیار نہ کرنے ہی کی تھی جس کے لیے انھوں نے بھی اس بارے میں کوشش ضروری سمجھی، جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور ممکن ہے کہ بعض مصنفین اب بھی کسی خاص ترتیب سے نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب کو دیکھنے کے متمنی ہوں۔ یہ دوسری چیز ہے اور اصل کلام کے بارے میں کسی شک وشبہ کا رکھنا دوسری چیز ہے۔

دسواں امر یہ ہے کہ تلاش کی جاتی ہے تو نہج البلاغہ کے مندرجہ خطب واقوال کا پتہ اب بھی بعیون الفاظہا نہج البلاغہ کے قبل تالیف شدہ کتابوں میں مل جاتا ہے اور جب کہ اکثر حصہ اس کا قبل کی کتابوں میں مندرج موجود ہے تو تھوڑا سا حصہ اگر دستیاب نہ بھی ہو تو ایک معتدل ذہن میں اس سے کوئی شک و شبہ پیدا نہیں ہو سکتا، جبکہ یہ معلوم ہے کہ دنیا میں مختلف حوادث کے ذیل میں کتابوں کے اتنے ذخیرے تلف ہوئے ہیں جو اگر موجود ہوتے تو یقینا موجودہ ذخائر سے بدرجہا زیادہ ہوتے۔ خود تاریخ نے کلامِ امیرالمومنینؑ کے جن جمع شدہ ذخیروں کا پتہ علامہ سید رضیؒ کے قبل ہم تک پہنچا دیا ہے، وہی سب اس وقت کہاں موجود ہیں؟ اس لیے اگر بعض مندرجات رائج الوقت کتابوں میں نہیں بھی ملتے تو ذہن یہی فیصلہ کرتا ہے کہ ان کتابوں میں موجود ہوں گے جن تک ہماری اس وقت دسترس نہیں ہے۔ نہج البلاغہ کے مندرجات کے ان حوالوں کو پہلے

علامہ شیخ ہادی کاشف الغطا نے مستدرک نہج البلاغہ کے اثنائے تالیف ہی میں مدارک نہج البلاغہ کے نام سے مرتب کیا تھا جو غالباً مکمل شائع نہیں ہوا ہے، اور ایک قابلِ قدر کوشش رام پور کے ایک سنی فاضل عرشی صاحب نے کی ہے جو فاران کراچی میں مقالے کی صورت میں شائع ہوئی ہے اور مزید تلاش کی جائے تو اس سلسلے میں مزید کامیابی کا بھی امکان ہے۔

گیارھواں امر یہ ہے کہ محققین علمائے شیعہ کا رویہ دیکھا جائے تو وہ ہر اس کتاب یا مجموعے کو جو معصومینؑ میں سے کسی کی طرف منسوب ہو، بلا چون و چرا صرف اس لیے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو جاتے کہ وہ معصومینؑ کی جانب منسوب ہے بلکہ وہ پوری فراخ حوصلگی کے ساتھ محققانہ فریضے کو انجام دیتے ہوئے اگر وہ قابلِ انکار ہوتا ہے تو کھل کر اس کا انکار کر دیتے ہیں اور اگر مشکوک ہوتا ہے تو شک و شبہ کا اظہار کر دیا کرتے ہیں۔ اس طرح بہت سے وہ ذخیرے جو کلام معصومین کے نام سے موجود ہیں، مقام اعتبار میں مختلف درجے اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً دیوانِ امیر المومنینؑ بھی تو بطورِ کلام علیؑ ہی رائج ہے، مگر علمائے شیعہ بلا رو رعایت اسے غلط سمجھتے ہیں۔ اس سے ذرا بالاتر درجہ تفسیرِ امام حسن عسکریؑ کا ہے، حالانکہ وہ شہرت میں تقریباً نہج البلاغہ سے کم نہیں ہے اور شیخ صدوق ایسے بلند مرتبہ قدیم محدث نے اس پر اعتماد کیا ہے، مگر اکثر علمائے شیعہ اسے تسلیم نہیں کرتے یہاں تک کہ ہماری قریبی دور کے محقق علامہ شیخ محمد جواد بلاغی نے ایک پورا رسالہ اس کے غلط ہونے کے اثبات میں لکھ دیا ہے۔ فقہ الرضاؑ امام رضا علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، مگر اس کے اعتبار اور عدم اعتبار کی بحث ایک مہتم بالشان علمی مسئلہ بن گئی ہے جس پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح جعفریات اور امام رضا علیہ السلام کا رسالہ ذہبیہ وغیرہ کوئی نقد و بحث سے نہیں بچا ہے۔ اس رویے کے باوجود سید رضیؒ کے بعد سے اس وقت تک کسی دور میں بھی کسی شیعہ عالم کا نہج البلاغہ کے خلاف آواز بلند نہ کرنا اور اس میں ذرہ بھر بھی شک و شبہ کا اظہار نہ کرنا اس کا ثبوتِ قطعی ہے کہ ان سب کی نظر میں اس کی حیثیت ان تمام مجموعوں سے ممتاز اور جداگانہ ہے۔ نہج البلاغہ کے ہم پلہ اس حیثیت سے اگر کوئی کتاب ہے تو وہ صرف صحیفۂ کاملہ جو اسی طرح مسلم طور پر امام زین العابدین علیہ السلام کے کلام کا مجموعہ ہے اور کوئی کتاب اس ذیل میں ان دونوں کے ہم مرتبہ نہیں ہے۔

مذکورہ بالا وجوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ علامہ سید رضیؒ کے بعد تقریباً دو، ڈھائی سو برس تک نہج البلاغہ کے خلاف کوئی آواز اٹھتے ہوئے معلوم نہیں ہوتی بلکہ متعدد علمائے اہل سنت نے اس کی شرحیں لکھیں، جیسے ابوالحسن علی ابن ابی القاسم بیہقی متوفی ۵۶۵ھ، امام فخر الدین متوفی ۶۰۶ھ، ابن ابی الحدید متوفی ۶۵۵ھ، علامہ سعد الدین تفتازانی وغیرہ۔ غالباً انھیں علمائے اہلِ سنت کے شروح وغیرہ لکھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ عوام میں نہج البلاغہ کا چرچا پھیلا اور اس کے ان مضامین کے بارے میں جو خلفائے ثلاثہ کے بارے میں ہیں، اہلِ سنت میں بے چینی پیدا ہوئی اور اب آپس میں بحثیں شروع ہو گئیں اور اس کی وجہ سے علماء کو اپنے اصول عقائد سنبھالنے کے لیے اور عوام کو تسلی دینے کے لیے نہج البلاغہ کے بارے میں شکوک و شبہات اور رفتہ رفتہ انکار کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ سب سے پہلے ابن خلکان، متوفی ۶۸۱ھ نے اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی اور علامہ سید مرتضیٰؒ کے حالات میں یہ لکھا:

قد اختلف الناس فی کتاب نهج البلاغة المجموعة من کلام علی ابن ابی طالب هل هو جمعه او اخوه الرضی و قد قیل انه لیس من کلام علی ابن ابی طالب وانما الذی جمعه و نسبه الیه هو الذی وضعه والله اعلم۔

لوگوں میں کتاب نہج البلاغہ کے بارے میں، جو امیر المومنینؑ ابن ابی طالب کے کلام کا مجموعہ ہے، اختلاف ہے کہ وہ ان ہی (سید مرتضیٰؒ) کا جمع کردہ ہے یا ان کے بھائی سید رضیؒ کا اور بعض کہتے ہیں کہ یہ جناب امیرؑ کا کلام ہی نہیں ہے، بلکہ جسے جامع سمجھا جاتا ہے، اسی کی یہ تصنیف ہے۔ واللہ اعلم۔

یہ امر بہت قابلِ لحاظ ہے کہ نہج البلاغہ کے بارے میں اختلافی آواز ڈھائی صدی کے بعد بھی نہج البلاغہ کے تالیف کے مرکز، یعنی بغداد یا ملکِ عراق کے کسی شہر سے بلند نہیں ہوئی، بلکہ مغربی مملکت جہاں بنی امیہ کی سلطنت تھی اور قیروان وقرطبہ میں جس سلطنت کے زیرِ اثر علماء کی پرورش ہورہی تھی، وہاں ابن خلکان مغربی کی زبان سے یہ آواز بلند ہورہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ جنھیں اختلف الناس کہا جا رہا ہے، یہ مسلمان دارالخلافے کے کوئی ذمہدار افراد نہیں ہیں، ورنہ اختلف العلماء، اختلف المحققون، اختلف الادباء ایسے کوئی وقیع الفاظ درج کیے جاتے، بلکہ یہ الناس اموی سلطنت کے پروردہ مملکتِ مغربیہ کے سنی عوام ہیں جنھیں یہ خبر تک نہیں ہے کہ یہ کتاب سید رضیؒ کی جمع کردہ ہے یا سید مرتضیٰؒ کی، اور یہ جناب ابن خلکان کا تقیہ ہے کہ وہ خود اپنے اطلاعات کو، جو اس کتاب اور اس کے جامع کے بارے میں یقیناً ان کو تھے، پیش نہیں کرتے بلکہ عوام کے جذبات کی تسلی کے لیے خود انھیں عوام کے اختلافات کی ترجمانی کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ بعض لوگ اسے سید مرتضیٰؒ کا جمع کردہ کہتے ہیں اور بعض سید رضیؒ کا اور خود ان کے ضمیر کا فیصلہ پہلے آجاتا ہے کہ جمع کرنے والا کوئی بھی ہو لیکن ہے وہ کلام امیرالمومنینؑ ہی کا۔ اور پھر عوامی جذبات کو دھچکا پہنچنے کے اندیشے سے وہ بعض ان متعصب مجہول الاسم والرسم اشخاص کے اس عذر کو جو اس مضامین کے تسلیم کرنے سے گریز کے لیے وہ مقام مناظرہ میں پیش کرتے تھے کہ ہم اسے کلام علیؑ ہی تسلیم نہیں کرتے۔ وہ قیل کہہ کے ذکر کر دیتے ہیں کہ بعض ایسا کہتے ہیں کہ یہ امیرالمومنینؑ کا کلام ہے ہی نہیں بلکہ جس نے جمع کیا ہے، اسی نے اس کو تصنیف کر دیا ہے۔ یہ خود قیل اس قول کے ضعف کے لیے کافی تھا، لیکن خود ان کا ضمیر اس قیل سے چونکہ مطمئن نہیں ہے لہٰذا آخر میں واللہ اعلم کہہ کے وہ اس میں مزید شک و شبہ کا اظہار کر دینا چاہتے ہیں۔ اس سے صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ ابن خلکان اس بارے میں اپنے فیصلے کو ماحول کے دباؤ سے ظاہر کرنا نہیں چاہتے اور وہ صرف عوام کی باہمی چہ میگوئیوں کا تذکرہ کر کے اپنا دامن بچا لے جانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تشکیک کا علمی دنیا میں کوئی وزن ہی نہیں مانا جا سکتا۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ اگرچہ علامہ ابنِ خلکان نے اپنے ضمیر کی تحریک سے بہت حد تک اپنے کو نہج البلاغہ کے انکار کی ذمے داری سے بچایا تھا، مگر ان کے ان الفاظ نے بعد والے میدانِ مناظرہ کے پہلوانوں کو آسانی سے یہ داؤ بتا دیا کہ وہ نہج البلاغہ کے کلامِ امیرالمومنینؑ ہونے کا انکار کر دیں۔ چنانچہ اس کے ایک صدی کے بعد ذہبی نے جو اپنے دور کے انتہائی متعصب شخص تھے، یہ جرأت کی کہ وہ اس شک کو یقین کا درجہ دے دیں اور انھوں نے سید مرتضیٰؒ کے حالات میں لکھ دیا کہ:

من طالع كتابه نهج البلاغة جزم بانه مكذوب على اميرالمومنين ففيه السب الصريح بل حط على السيدين ابى بكر و عمر۔

جو شخص ان کی کتاب نہج البلاغہ کو دیکھے، وہ یقین کر سکتا ہے کہ امیرالمومنین حضرت علیؑ کی طرف اس کی نسبت بالکل جھوٹ ہے، اس لیے کہ اس میں کھلا ہوا سب وشتم اور ہمارے دونوں سرداروں ابوبکر اور عمر کی تنقیص ہے۔

اب آپ ذرا اس عجیب رفتار کو دیکھیے کہ تالیفِ نہج البلاغہ سے دو، ڈھائی سو برس بعد، یعنی ابن خلکان کے عہد تک تو اختلاف یا شک و شبہ کا بھی نہج البلاغہ کے بارے میں پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بعد ابن خلکان ملکِ مغرب میں بیٹھ کر عوام الناس کے اختلاف کا اس بارے میں اظہار کرتے ہیں کہ یہ سید مرتضیٰ کی جمع کردہ کتاب ہے یا سید رضیؒ کی اور ایک ضعیف قول اس کا بیان کرتے ہیں کہ اس کی نسبت امیرالمومنینؑ کی جانب غلط ہے اور پھر واللہ اعلم کہہ کر اس تغلیط کو مشکوک کرتے ہیں۔ یہ اس وقت جب کہ قربِ عہد کی وجہ سے پھر بھی ذرائع اطلاع زیادہ ہو سکتے تھے اور اس کے ایک صدی کے بعد ذہبی پہلے تو بیک گردشِ

قلم اس اختلاف کو، جو جامع کے بارے میں تھا، ختم کر کے اسے سید مرتضیٰؒ کا کارنامہ قرار دے دیتے ہیں اور پھر اس شک کو یقین کا درجہ دے کر یہ کہتے ہیں کہ جو بھی نہج البلاغہ کا مطالعہ کرے وہ ایسا ہی یقین کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے وقت تک تین سو برس میں گویا کسی نے اس کتاب کا مطالعہ ہی نہ کیا تھا یا انھیں کوئی ایسی عینک ملی ہے جو اس کے پہلے کسی کے پاس نہ تھی اور اب وہ اسی عینک سے اپنے دور کے بعد ہر شخص کو نہج البلاغہ کے مطالعے کی دعوت دے رہے ہیں۔ وہ عینک کیا ہے، اسے خود اپنے آخرِ کلام میں درج کر دیتے ہیں۔ علمی حیثیت سے اصولِ روایت کے لحاظ سے تنقیدی قوانین کے پیشِ نظر انھیں چاہیے تھا کہ اس کی نسبت غلط ہونے کے ثبوت میں امیرالمومنینؑ کا وہ مسلم کلام پیش کرتے جو سید رضیؒ کے علاوہ دوسرے مستند ماخذوں سے ان کے نزدیک مسلم ہوتا اور وہ سید رضی سے مندرجہ مضامین سے مختلف ہوتا، خود سید رضیؒ کے زمانے والے مصنفین کے انتقادات کے حوالے دیتے کہ انھوں نے بھی اسے غلط قرار دیا ہے۔ اس تین سو برس کی مدت میں دوسرے علمأ و ناقدین نے جو کچھ اس کی رد و قدح کی ہوتی، اسے پیش کرتے، مگر ان کے جیب و دامنِ تحقیق میں کوئی ایسی سند موجود نہیں ہے۔ ان کی دلیل اس نسبت کے یقینی طور پر جھوٹ ہونے کی صرف یہ ہے کہ اس میں ان کے دوسرداروں کی تنقیص ہے۔ کیا علمی دنیا میں اس دلیل کی کوئی قیمت ہو سکتی ہے؟ یہ بالکل ایسا ہے جیسے قرآن نازل ہونے کے چند صدی بعد کوئی طبقہ مشرکین کا قرآن کے کلام الٰہی ہونے سے صرف اس لیے انکار کرے کہ اس میں ان کے الٰہہ کے خلاف تنقیص و مذمت کی آیتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حقیقت کو اپنے جذبات کا تابع بنا کر اگر جانچا جائے تو کوئی حقیقت باقی ہی نہیں رہ سکتی۔ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔ (''سورہ مومنون آیت ۷۱/) اس دروازے کے کھل جانے کے بعد تمام اصولِ روایت و درایت معطل و بے کار ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ ہر عقیدے اور خیال کا انسان پھر ہر قوی سے قوی

نص کو صرف اس بنا پر رد کر دے گا کہ وہ اس کے عقیدے اور خیال کے خلاف ہے۔ جہاں تک خلفائے ثلاثہ کے مقابل میں شیعوں کے استدلال کا تعلق ہے وہ احادیثِ رسولؐ یہاں تک کہ صحاحِ ستہ میں درج شدہ اخبار و احادیث سے بھی اس میں تمسک کرتے ہیں اور نہج البلاغہ کے مندرجات سے کچھ کم وہ احادیثِ پیغمبرؐ سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ محتاط اور علمی اصول کے کسی حد تک پابند علمائے اہلِ سنت کا یہ طریقہ رہا کہ وہ ان احادیث کے مضامین و مطالب کے تاویلوں سے ہمیشہ کام لیتے رہے اور بالکل ان احادیث کے انکار کی جرأت نہیں کی۔ مناظرانہ ضرورتوں سے انکار نصوص کا یہ رجحان جس کا مظاہرہ ذہبی نے کیا ہے، یہ بڑھتے بڑھتے مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے زمانے میں یہاں تک آیا کہ شروع شروع عیسائی مبلغین سے مناظرے میں انھیں وفاتِ مسیح کے خیال کو پیش کرنے کی ضرورت ہوئی۔ صرف اس جذبے کے ماتحت کہ جنابِ عیسیٰؑ کی یہ ایک طرح کی فضیلت عیسائی پیش کرتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں، لہٰذا اس کو ختم کرنا چاہیے۔ انھوں نے اس مناظرانہ ترکیب کو اصل قرار دیا اور پھر جو اسلامی نصوص اور متفق علیہ احادیث اس بارے میں تھے، ان سب کا انکار کر دیا اور آخر میں خود ان کے دعوائے مسیحیت کے لیے ایک راستہ بن گیا۔ یہی جذبہ ترقی کر کے اب اہلِ قرآن کے ہاتھوں، جن کی نمائندگی طلوعِ اسلام وغیرہ کر رہے ہیں، یہاں تک پہنچا ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے کہ طبری اور دوسرے مفسرین اور مورخین سب کے یہاں کچھ نہ کچھ شیعوں کے موافق باتیں موجود ہیں، اس لیے کلیتہً احادیثِ تفاسیر اور تواریخ کے اعتبار پر انھوں نے ضرب لگا دی ہے اور ان سب کے انکار کی یہی بنیاد ہے کہ ان لوگوں نے شیعوں کے موافق چیزیں درج کی ہیں، لہٰذا یہ سب جھوٹ ہے۔ جو عمارت ایک غلط اساس پر قائم کی جاتی ہے، اس کا آخری انجام یہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ حقیقت کو صرف حقیقت کے اعتبار سے دیکھتے اور پھر اپنے جذبات کو اس کے ماتحت لانے کی کوشش کرتے جو ایک عام

مسلمان کا فریضۂ ایمانی ہے، چہ جائیکہ وہ افراد جو اپنے کو علمائے اسلام قرار دیتے ہوں یا دنیا میں اس حیثیت سے متعارف ہوں۔

اس کے بعد کی صدیوں میں یہ دروازہ پاٹوں پاٹ کھل ہی گیا تھا، چنانچہ اب تو مناظرے کے میدان کا یہ بہت ہی عام ہتھیار بن گیا کہ جب نہج البلاغہ کا کوئی کلام پیش ہو تو اسے غلط کہہ دیا جائے۔ اس کے بعد پھر موجودہ دور میں تو اور بھی بہت سے جذبات کارفرما ہوگئے ہیں۔ مثلاً تجدد پسند طبقے کا یہ رجحان کہ عورت ہر بات میں مرد کے برابر ہے، جب نہج البلاغہ کے مندرجات سے مجروح ہوتا ہے تو اس جذبے کے تحفظ کے لیے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ حضرت علیؑ کا کلام نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں عورتوں کی تنقیص ہے، اور موجودہ سائنس سے اس کے نظریات کو ٹکراتے ہوئے دیکھا جاتا ہے تو سائنس کو اصل قرار دے کر اس کا انکار کر دیا جاتا ہے کہ یہ حضرت علیؑ کا کلام ہو، کبھی اس جذبے کے ماتحت کہ اس میں ان علوم و فنون کی حقیقتوں کا اظہار ہے جسے بعد والے اپنے وقت کا کارنامہ سمجھتے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام بعد کی پیداوار ہے، اس لیے کہ اس وقت عرب میں یہ علوم وفنون تھے ہی نہیں، یہاں تک کہ کسی ایک لفظ مثلاً سلطان بمعنی بادشاہ کو حادث قرار دے کر اس لفظ کے استعمال کو نہج البلاغہ میں اس کی دلیل بنایا جاتا ہے کہ یہ جنابِ امیرؑ کی زبان سے نہیں نکل سکتا، حالانکہ یہ سب باتیں صرف اپنی خواہشوں کی تکمیل کا ایک بہانہ ہیں اور اپنے مزعومات کو اصل قرار دے کر حقیقتوں کو ان کا تابع بنا لینے کا کرشمہ ہے۔ قرآنِ مجید میں درج شدہ حقائق کب ایسے ہیں جو اس وقت کے عربوں کو معلوم ہوں اور احادیثِ رسولؐ کے بہت سے معارف کب اس وقت کی دنیا کو معلوم تھے جو بابِ مدینۃ العلم کے اقوال میں کچھ ایسے علوم وفنون کے انکشاف پر تعجب کیا جائے جن سے اس وقت کی دنیا باخبر نہ تھی ہر لفظ جس کے لئے کسی قدیم عربی شعر کو سند میں پیش کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اس شعر سے پہلے اس کے ماخذ کا ہمیں علم نہیں ہوتا، ورنہ اس شعر کو ہم سند ہی قرار دینے کی کیوں زحمت محسوس کرتے۔ تو کیا اس تصور کو حقیقت قرار دے کر کہ اس کے پہلے یہ لفظ کہیں نہیں ہے، ہم اس شعر کا انکار کر دیں گے یا صحیح طریقہ یہ ہوگا اور یہی اصول معمول بہ ہے کہ اس شعر میں اس لفظ کے وجود سے خود ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس لفظ کا زبانِ عرب میں رواج تھا۔ اسی طرح ہم آخر لفظ سلطان میں یہ اصول کیوں اختیار کرتے ہیں کہ ہم اپنے اس مزعومہ کو وحی کی منزل قرار دیں کہ یہ لفظ حادث ہے اور کلامِ عرب میں موجود نہ تھی خود جناب امیر المومنین علیہ السلام کے کلام میں اس کا وارد ہونا اس کا ثبوت کیوں نہ ہو کہ یہ لفظ چاہے عالم اکثریت کی زبان پر جاری نہ ہو لیکن وہ کلیتہً مفقود نہیں تھی کلام اور اس کا شاہد یہی کلامِ امیر المومنینؑ کیوں قرار نہ پائے۔ پھر السلطان کو لفظی طور پر بمعنی ملک قرار دینے کی ضرورت ہی کیا ہے جب کہ وہ بمعنی مصدری یعنی حکومت و اقتدار اور غلبہ یقینی موجود تھا اور قرآنِ مجید میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ ذریعۂ غلبہ ہونے ہی کی بنا پر دلیل کو سلطان کہا گیا ہے جس طرح اسی اعتبار سے اس کو حجت کہا جاتا ہے اور یہی معنی مصدری بعد میں اسی شکل اختیار کر کے بمعنی ملک ہو گئے ہیں، تو اس میں کیا دشواری ہے کہ **اذا تغیر السلطان تغیر الزمان** میں ہم السلطان کو حاکم کے معنی میں نہیں بلکہ حکومت و اقتدار کے معنی میں لیں جو ہماری زبان میں بھی بمعنی حاکم برابر رائج ہے۔ لفظی طور پر یہ معنی نہ کہیں کہ جب بادشاہ بدلتا ہے تو زمانہ بدل جاتا ہے، بلکہ یہ معنی کہیں کہ جب اقتدار بدلتا ہے تو زمانے میں بھی تغیر ہو جاتا ہے۔ نتیجہ وہی ایک ہے، مگر وہ ہمارا مزعومہ بھی اگر ہمیں بہت عزیز ہو تو اس صورت میں محفوظ رہتا ہے غرض یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں جو کسی اصولِ روایت ودرایت پر منطبق نہیں ہوتیں۔ خلفا کے بارے میں نہج البلاغہ میں ہرگز کوئی ایسی سخت بات نہیں ہے جو دوسری کتابوں میں موجود نہ ہو اور جنابِ امیر علیہ السلام کے ان رجحانات کے مطابق نہ ہو جو مسلم الثبوت حیثیت سے دوسرے کتبِ اہل سنت میں بھی موجود ہیں۔ ایسی صورت میں اس قسم کے الفاظ کا حضرت کی زبان پر آنا تو اس

کا ثبوت ہے کہ وہ آپ کا کلام ہے۔ ہاں! اگر آپ کے واقعی رجحانات کے خلاف اس میں الفاظ ملتے تو اس پر تو غور کرنے کی بھی ضرورت ہوتی کہ وہ کس بنا پر ہیں یا انھیں کسی مجبوری کا نتیجہ قرار دینا پڑتا جیسے بعض علماء کے خیال مطابق للہ بلا فلان والا خطبہ یہی نوعیت رکھتا ہے۔ مگر وہ کلام جو اپنے متکلم کے خیالات کا نمایاں طور پر آئینہ بردار ہو، اسے تو کسی حیثیت سے اس متکلم کی طرف نسبت صحیح ماننے میں تامل کا کوئی سبب ہی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ باوجود ابنِ خلکان کے اس اظہارِ تذبذب اور ذہبی کے اس جسارتِ انکار کے، پھر بھی منصف مزاج اور حقیقت پسند علماء و محققین بلا تفریقِ مذہب و ملت نہج البلاغہ کے مندرجات کو کلامِ امیرالمومنینؑ مانتے رہے اور اس کا اظہار کرتے رہے جن میں سے کچھ افراد کا جو سرِ دست پیشِ نظر ہیں، ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

(۱) علامہ شیخ کمال الدین محمد ابن طلحہؒ قریشی شافعی، متوفی ۶۵۲ھ اپنی کتاب مطالب السؤل فی مناقبِ آل الرسول میں، جو لکھنؤ میں بھی طبع ہو چکی ہے، علوم امیرالمومنینؑ کے بیان میں لکھتے ہیں۔

ورابعها علم البلاغة والفصاحة وكان فيها اماما لا يشق غبارہ و مقدما لا تلحق اثارہ و من وقف على كلامه المرقوم الموسوم بنهج البلاغة صار الخبر عندہ عن فصاحته عيانا والظن بعلو مقامه فيه ايقانا۔

چوتھے علمِ فصاحت و بلاغت، آپ اس میں امام کا درجہ رکھتے تھے جن کے گردِ قدم تک بھی پہنچنا ناممکن ہے، اور ایسے پیشرو تھے جن کے نشانِ قدم کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، اور جو حضرت کے اس کلام پر مطلع ہو جو نہج البلاغہ کے نام سے موجود ہے، اس کے لیے آپ کی فصاحت کی سماعی خبر مشاہدہ بن جاتی ہے اور آپ کی بلندی مرتبہ کا اس باب میں گمان یقین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

النوع الخامس في الخطب والمواعظ مما نقلته الرواۃ ورته الثقات عنه عليه السلام قد اشتمل كتاب نهج البلاغة المنسوب اليه على انواع من خطبه و مواعظه الصادعة بأو امرها و نواهيها المطلعة انوار الفصاحة والبلاغة مشرقة من الفاظها و معانيها الجامعة حكم عيون علم المعاني والبيان على اختلاف اساليبها۔

پانچویں قسم ان خطب اور مواعظ کی شکل میں جس کو راویوں نے بیان کیا ہے اور ثقات نے حضرت سے ان کو نقل کیا ہے، اور نہج البلاغہ کتاب جس کی نسبت حضرت کی طرف دی جاتی ہے، وہ آپ کے مختلف قسم کے خطبوں اور موعظوں پر مشتمل ہے جو اپنے اوامر و نواہی کو مکمل طور پر ظاہر کرتے اور فصاحت و بلاغت کے انوار کو اپنے الفاظ و معانی سے تابندہ شکل میں نمودار کرتے اور فنِ معانی و بیان کے اصول اور اسرار کو اپنے مختلف اندازِ بیان میں ہمہ گیر صورت سے ظاہر کرتے ہیں۔

اس میں مندرجاتِ نہج البلاغہ کو معتبر و ثقہ راویوں کے بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے یقینی طور پر کلامِ امیرالمومنینؑ تسلیم کیا ہے۔ ایک جگہ جو منسوب کی لفظ ہے، اس سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے، وہ بحیثیتِ مجموعی کتاب بشکلِ کتاب سے متعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب امیرالمومنینؑ کی جمع کردہ نہیں ہے۔ کتاب تو حقیقۃً سید رضیؒ ہی کی ہے، مگر عوام مجازی طور پر یا ناواقفیت کی بنا پر یونہی کہتے ہیں یہ امیرالمومنینؑ کی کتاب ہے۔ یہ نسبت اس کلام کے لحاظ سے دی جاتی ہے جو اس کتاب میں درج ہے اور اسی لیے اس محل پر علامہ ابنِ طلحہؒ نے منسوب کی لفظ صرف کی ہے جو بالکل درست ہے، اس سے اصل کلام کے بارے میں ان کے وثوق و اطمینان کو کوئی دھچکا نہیں پہنچتا۔

(۲) علامہ ابو حامد عبدالحمید ابن ہبۃ اللہ المعروف بابن ابی الحدید مدائنی بغدادی، متوفی ۶۵۵ھ جنھوں نے اس کتاب کی مبسوط شرح لکھی ہے، وہ حضرتِ امیر علیہ السلام کے فضائلِ ذاتیہ میں فصاحت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

اما الفصاحة فهو امام الفصحاء و سیدالبلغاء و عن کلامه قیل دون کلام الخالق وفوق کلام المخلوقین و منه تعلم الناس الخطابة والکتابة۔

فصاحت کی آپ کا یہ عالم ہے کہ آپ فصحا کے امام اور اہلِ بلاغت کے سرگروہ ہیں۔ آپ ہی کے کلام کے متعلق یہ مقولہ ہے کہ وہ خالق کے کلام کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے اور آپ ہی سے دنیا نے خطابت و بلاغت کے فن کو سیکھا۔

اس کے بعد عبدالحمید بن یحییٰ اور ابنِ نباتہ کے وہ اقوال درج کیے گئے ہیں جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں، پھر لکھا ہے:

ولما قال محقن ابن ابی محقن لمعاویة جئتك من عنداعبی الناس قال له و یحك کیف یکون اعبی الناس فوالله ما سن الفصاحة لقریش غیره و یکفی هذا الکتاب الذی نحن شارحوه دلالة علی انه لا یجاری فی الفصاحة ولا یباری فی البلاغة۔

اور جب محقن بن ابی محقن نے (خوشامد میں) معاویہ سے کہا کہ میں سب سے زیادہ گنگ شخص کے پاس سے آیا ہوں، معاویہ نے کہا کہ وائے ہو تم پر، وہ گنگ کیونکر کہے جا سکتے ہیں، حالانکہ خدا کی قسم فصاحت کا راستہ قریش کو سوا ان کے کسی اور نے نہیں دکھایا ہے اور یہی کتاب، جس کی ہم شرح لکھ رہے ہیں، اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ حضرت فصاحت میں وہ بلند درجہ رکھتے ہیں کہ کوئی آپ کے ساتھ نہیں چل سکتا اور بلاغت میں آپ کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

علامۂ مذکور دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

ان کثیرا من فصوله داخل فی باب المعجزات المحمدیة لا شتمالها علی الاخبار الغیبیة وخروجها من وسع الطبیعة البشریة۔

اس کتاب کے اکثر مقامات حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ کہے جا سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ غیبی خبروں پر مشتمل ہیں اور انسانی طاقت کے حدود سے باہر ہیں۔

حالانکہ علامہ ابن ابی الحدید اپنے معتقدات میں، جو شیعیت کے خلاف ہیں، پورے راسخ ہیں اور اس لیے نہج البلاغہ میں جہاں جہاں ان کے معتقدات کے خلاف چیزیں ہیں، ان کو کافی زحمت درپیش ہوئی ہے، مگر اس کے باوجود کسی ایک مقام پر بھی وہ اس شک وشبہ کا اظہار نہیں کرتے کہ یہ شاید امیرالمومنینؑ کا کلام نہ ہو، بلکہ خطبہ شقشقیہ تک میں، جو سب سے زیادہ ان کے جذبات کے خلاف مضامین پر مشتمل ہے، وہ اس امر کو بقوت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ہے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ضرور اور اس کے خلاف ہر تصور کو دلائل کے ساتھ رد کر دیتے ہیں۔ انھوں نے خطبے ہی میں قدم المفضول علی الفاضل خدا نے (معاذ اللہ!) کسی مصلحت سے غیر افضل کو افضل پر مقدم کر دیا اور اسی طرح خطبۂ شقشقیہ وغیرہ کے تشریحات میں انھوں نے اپنے معتقدات کا اظہار کر دیا ہے اور امیرالمومنینؑ کے الفاظ کو، معاذ اللہ! آپ کے بشری جذبات کا تقاضا قرار دیا ہے۔ یہ امور اس تصور کو ختم کر دیتے ہیں کہ انھوں نے اس کتاب میں اس شیعہ رئیس کی خوشامد مدِنظر رکھی ہے جس کے نام پر انھوں نے یہ شرح معنون کی تھی۔ ابن العلقمی شیعہ ضرور تھے، مگر وہ سلطنتِ بنی عباس کے وزیر تھے اور یہ کتاب دولتِ عباسیہ کے سقوط سے پہلے ان کے دورِ وزارت میں لکھی گئی ہے۔ اول تو اگر خوشامد مدِنظر ہوتی تو وزیر کے بجائے خود خلیفۂ وقت کے جذبات کا لحاظ کرنا زیادہ ضروری ہوتا۔ دوسرے ظاہر ہے کہ سلطنتِ عباسیہ کے وزیر ہونے کی بنا پر خود ابن العلقمی بھی کھل کر ایسے شخص کے خلاف کوئی اقدام نہیں کر سکتے تھے جو حکومتِ وقت کے مذہب کے موافق کوئی بات کہے نہ وہ خود ہی ایسے جذبات کا علانیہ اظہار کرتے تھے۔ پھر اگر ان کی خوشامد ہی پیشِ نظر ہوتی تو ابن ابی الحدید اسی کتاب میں شیعیت کی رد کیوں کرتے اور خلافتِ ثلاثہ کو شروع سے لے کر آخر تک بقدرِ امکان مضبوط کرنے کی کوشش کس لیے کرتے؟ ان کا یہ طرزِ عمل صاف بتا رہا ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں اپنے حقیقی

خیالات اور جذبات کو برابر پیشِ نظر رکھا ہے۔ وہ اگر نہج البلاغہ کی صحت میں ذرا سا شک وشبہ کا بھی اظہار کر دیتے تو وہ اس سے زیادہ ابن العلقمی کے لیے تکلیف دہ نہیں ہوسکتا تھا جتنا خدا کی طرف اس غلط کام کو منسوب کرنا کہ وہ مفضول کو فاضل پر ترجیح دے دیتا ہے یا امیر المومنینؑ کے اقوال کو، معاذ اللہ! نفسانیت پر محمول کرنا جو خطبۂ شقشقیہ وغیرہ کی شرح میں انھوں نے لکھ ڈالا ہے، بلکہ ایک شیعہ کے لیے ان الفاظ کے کلامِ امیر المومنینؑ ہونے سے انکار کر دینا اتنا صدمہ نہیں پہنچا سکتا اور حضرتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ کی اتنی بڑی توہین نہیں ہے جتنا یہ تصور کرنا کہ حضرت نے، معاذ اللہ! حقیقت کے خلاف صرف اپنی ذاتی رنجش کی بنا پر یہ الفاظ فرما دیئے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہرگز ابن ابی الحدید کو ابن العلقمی کی کوئی خاطر داری اظہارِ خیالات میں پیشِ نظر نہ تھی اور کتاب پر ابن العلقمی نے اگر کوئی انعام دیا ہو تو یہ صرف ان کے وسعتِ صدر اور وسعتِ نظر اور تحمل کا ثبوت ہے کہ انھوں نے ایک مخالفِ مذہب کے ایک علمی کارنامے کی صرف علمی کارنامہ ہونے کی بنا پر قدر کی جو ان کے خود عقائد و خیالات سے متضاد مضامین پر بھی مشتمل تھا۔ میرے خیال میں تو ابن ابی الحدید نے اپنی سنیت کو اس کتاب میں اتنا ضرورت سے زیادہ طشت از بام کیا ہے کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی رورعایت کا تصور بھی پیدا ہونا غلط ہے۔

(۳) ابوالسعادات مبارک مجدالدین ابن اثیر جزری، متوفی ۶۰۶ھ نے اپنی مشہور کتاب نہایہ میں، جو احادیث و آثار کے لغات کی شرح کے موضوع پر ہے، کثیر التعداد مقامات پر نہج البلاغہ کے الفاظ کو حل کیا ہے۔ ابن اثیر کی حیثیت فقط ایک عام لغوی کی نہیں ہے بلکہ وہ محدث بھی ہیں۔ اگر صرف ادبی اہمیت کے لحاظ سے ان کو ان الفاظ کا حل کرنا ہی ضروری تھا تو وہ اس کو نہج البلاغہ کا نام لکھ کر درج کرتے۔ پھر واقعہ تو یہ ہے کہ اگر اس کو وہ کلامِ امیر المومنینؑ سمجھتے ہی نہ تو انھیں اس کتاب میں، جو صرف احادیث اور آثار کے حل کے لیے لکھی گئی ہے، ان لغات کو جگہ ہی نہ دینا چاہیے تھی، کیونکہ اصطلاحی طور پر اثر صرف صحابہ اور ممتاز تابعین کی زبان سے نکلے ہوئے اقوال کو کہتے ہیں۔ کسی متاخر عالم کی کتاب کے الفاظ نہ حدیث میں داخل ہیں اور نہ اثر میں۔ ان کا ان الفاظ کو جگہ دینا ہی اس کا ثبوت ہے کہ وہ اس کو سید رضیؒ کا کلام نہیں سمجھتے بلکہ کلام امیر المومنینؑ قرار دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان لغات کو درج کرنے میں ہر مقام پر تصریحاً وہ حدیثِ علیؑ کی لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ جیسے لغت جوی میں **منه حديث علی** یونہی **فتق الاجواء و شق الارجاء** میں زیادہ تر ان الفاظ کا تذکرہ **حدیث علی** کی لفظوں کے ساتھ ہے اور کہیں **خطبة علی** ہے جیسے لغت لوط میں **فی خطبة علی ولا طها بالبلة حتی لزبت**۔ ایک جگہ لغت ایم میں یہ الفاظ ہیں:

کلام علی مات قیها وطال تایمها۔ اسی طرح لغت اسل میں **فی کلام علی** کے الفاظ ہیں اور ایسے ہی دو، ایک جگہ اور باقی تمام مقامات پر حدیث علی لکھا ہے اور جو مکاتیب کے الفاظ ہیں، انھیں کتاب علیؑ کہہ کر درج کیا ہے۔ ان تمام مقامات کو استقصا کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب ''نہج البلاغہ کا استناد'' میں درج کیا ہے جو امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

(۴) علامہ سعدالدین تفتازانی، متوفی ۷۹۱ھ شرحِ مقاصد میں لکھتے ہیں **واذا هو افصحهم لسانا علی ما یشهد به کتاب نهج البلاغة**۔ حضرت سب سے زیادہ فصیح اللسان بھی تھے جس کی گواہی کتاب نہج البلاغہ دے رہی ہے۔

(۵) جمال الدین ابوالفضل محمد بن مکرم بن علی افریقی مصری، متوفی ۷۱۱ھ انھوں نے بھی نہایہ کی طرح اپنی عظیم الشان کتاب لسان العرب میں مندرجہ الفاظ کو کلامِ علیؑ کہتے ہوئے حل کیا ہے۔

(۶) علامہ علاء الدین قوشجی، متوفی ۸۷۵ھ شرحِ تجرید میں قولِ محقق طوسی **افصحهم لسانا** کی شرح میں لکھتے ہیں: **علی ما یشهد به کتاب نهج البلاغة و قال البلغاء ان کلامه دون کلام الخالق و فوق کلام المخلوق** جس کی شاہد ہے۔ آپ کی کتاب نہج البلاغہ اور اہلِ بلاغت کا

قول ہے کہ آپ کا کلام خالق کے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر ہے۔

(۷) محمد بن علی بن طباطبا معروف بہ ابن طقطقی اپنی کتاب **تاریخ الفخری فی الآداب السلطانیه والدول الاسلامیه**، مطبوعہ مصر،ص ۹ میں لکھتے ہیں:

عدل ناس الی نهج البلاغة من کلام امیرالمومنین علی ابن ابی طالب فانه الکتاب الذی یتعلم منه الحکم والمواعظ و الخطب والتوحید والشجاعة والزهد و علوالهمة وادنیٰ فوائده الفصاحة والبلاغة۔

بہت سے لوگوں نے کتاب نہج البلاغہ کی طرف توجہ کی جو امیرالمومنینؑ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام ہے، کیونکہ یہ وہ کتاب ہے کہ جس سے حکم اور مواعظ او رتوحید اور زہد اور علوہمت، ان تمام باتوں کی تعلیم حاصل ہوتی ہے اور اس کا سب سے ادنیٰ فیض فصاحت و بلاغت ہے۔

(۸) علامہ محدث ملا طاہر فتنی گجراتی۔ انھوں نے بھی مجمع بحارالانوار، نہایہ کی طرح احادیث و آثار کے لغات ہی کی شرح میں لکھی ہے اور انھوں نے بھی الفاظ نہج البلاغہ کو کلام امیرالمومنینؑ تسلیم کرتے ہوئے ان کی شرح کی ہے۔

(۹) علامہ احمد بن منصور کا زردنی اپنی کتاب مفتاح الفتوح میں امیرالمومنینؑ کے حالات میں لکھتے ہیں:

ومن تامل فی کلامه و کتبه و خطبه و رسالاته علم ان علمه لا یوازی علم احد و فضائله لا تشاکل فضائل احد بعد محمد صلی الله علیه وسلم ومن جملتها کتاب نهج البلاغه۔

جو حضرت کے کلام اور خطوط اور خطبوں اور تحریروں پر غور کی نگاہ ڈالے، اسے معلوم ہوگا کہ حضرت کا علم کسی دوسرے کے علم کی طرح اور حضرت کے فضائل پیغمبرؐ کے بعد کسی دوسرے کے فضائل کے قبیل سے نہیں تھے (یعنی بدرجہا زیادہ تھے)، اور انھیں میں سے کتاب نہج البلاغہ ہے (اس کے معنی یہ ہیں کہ مصنف کے پیش نظر یہ حقیقت تھی کہ حضرت کے کلام کا ذخیرہ نہج البلاغہ کے علاوہ بھی کثرت کے ساتھ موجود ہے اور یہ صرف اس کا ایک جز ہے)۔

وایم الله لقد وقف دونه فصاحة الفصحاء و بلاغة البلغاء وحکمة الحکماء۔

اور خدا کی قسم! آپ کی فصاحت کے سامنے تمام فصحا کی فصاحت اور بلیغوں کی بلاغت اور حکمائے روزگار کی حکمت مفلوج و معطل ہوکر رہ جاتی ہے۔

(۱۰) علامۂ یعقوب لاہوری شرحِ تہذیب الکلام میں افصح کی شرح میں لکھتے ہیں:

ومن ارادا مشاهدة بلاغته ومسامعة فصاحته فلینظر الی نهج البلاغة ولا ینبغی ان ینسب هذا الکلام البلیغ الی رجل شیعی۔

جو شخص آپ کی فصاحت کو دیکھنا اور آپ کی بلاغت کو سننا چاہتا ہو وہ نہج البلاغہ پر نظر کرے اور ایسے فصیح و بلیغ کلام کو کسی شیعہ عالم کی طرف منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔

(۱۱) علامہ شیخ احمد ابن مصطفی معروف بہ طاشکبری زادہ اپنی کتاب شقائقِ نعمانیہ فی علمائے دولتِ عثمانیہ قاضی قوام الدین یوسف کی تصانیف کی فہرست میں لکھتے ہیں:

و شرح نهج البلاغة الامام الهمام علی بن ابی طالب کرم الله تعالیٰ وجهه۔

(۱۲) مفتیِ دیارِ مصر یہ علامہ شیخ محمد عبدہ، متوفی ۱۳۲۳ھ جن کی اس سعی جمیل کے مشکور ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں مصر اور بیروت وغیرہ اہل سنت کے علمی مرکزوں کو نہج البلاغہ کے فیوض سے بہرہ مند بنانے کا سامان کیا اور وہاں کے باشندوں کو ان کے سبب سے اس جلیل القدر کتاب کا تعارف ہو سکا۔ انھوں نے نہج البلاغہ کو اپنے تفسیری حواشی کے ساتھ مصر میں چھپوایا جس کے بہت سے ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ وہ

اپنے اس مقدمے میں جو شروعِ کتاب میں درج کیا ہے، اپنی اس دہشت و حیرت کا اظہار کرتے ہوئے جو نہج البلاغہ کے حقائق آگیں عبارات سے ان پر طاری ہوئی ہے، تحریر کرتے ہیں۔

کان یخیل الی فی کل مقام ان حر و باشبت و غارات شنت و ان للبلاغة دولة و للفصاحة صولة وان الاوهام عرامة و للریب دعارة وان جحافل الخطابة و کتائب الذرابة فی عقود النظام وصفوف الانتظام تنافح بالصفیح الابلج والقویم الاملج و تمثلج المهج بروائع الحجج فتفل من دعارة الوساوس و تصیب مقاتل الخوانس فما انا الا والحق متنصر والباطل منکسر و مرج الشك فی خمود و هرج الریب فی رکود ان مدبر تلك الدولة و باسل تلك الصولة هو حامل لوائها الغالب امیر المومنین علی بن ابی طالب بل کنت کلما انتقلت من موضع الیٰ موضع احس بتغیر المشاهد و تحول المعاهد فتارة کنت اجدنی فی عالم یعمره من المعانی ارواح عالیه فی حلل من العبارات الزاهیة تطوف علی النفوس الزاکیة و تدنو من القلوب الصافیة توحی الیها رشادها و تقوم منها منا دها و تنفربها عن مداحض المزال الیٰ جواد الفضل والکمال و طور اکانت تنکشف لی الجمل عن وجوه باسرة وانیاب کاشرة و ارواح فی اشباح النمور و مخالب النسو رقد تحفزت للوثاب ثم انقضت للاختلاب فجلبت القلوب عن هواها واخذت الخواطر دون مرماها واغتالت فاسد الاهواء و باطل الآراء واحیانا کنت اشهد ان عقلا نورانیا لا یشبه خلقاً جسدانیا فصل عن الموکب الالهیٰ واتصل بالروح الانسانی فخلعه عن غاشیات الطبیعة و سمابه الی الملکوت الاعلیٰ و نمابه الی مشهد النور الاجلیٰ و سکن به الیٰ عمار جانب التقدیس بعد استخلاصه من شوائب التلبیس وانات کانی اسمع خطیب الحکمة ینادی باعلیآء الکلمة واولیاء امر الامة یعرفهم مواقع الصواب و یبصرهم مواضع الارتیاب و یحذرهم مزلق الاضطراب و یرشدهم الیٰ دقائق السیاسة ویهدیهم طریق الکیاسة و یرتفع بهم الیٰ منصات الریاسة و یصعدهم شرف التدبیر و یشرف بهم علیٰ حسن المصیر۔

ہر مقام پر (اس کے اثنائے مطالعہ میں) مجھے ایسا تصور ہو رہا تھا کہ جیسے لڑائیاں چھڑی ہوئی ہیں، نبرد آزمائیاں ہو رہی ہیں، بلاغت کا زور ہے اور فصاحت پوری قوت سے حملہ آور ہے، توہمات شکست کھا رہے ہیں، شکوک و شبہات پیچھے ہٹ رہے ہیں، خطابت کے لشکر صف بستہ ہیں، طلاقتِ لسان کی فوجیں شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں مصروف ہیں، وسوسوں کا خوں بہایا جا رہا ہے اور توہمات کی لاشیں گر رہی ہیں۔ اور ایک دفعہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بس حق غالب آ گیا اور باطل کی شکست ہو گئی اور شک و شبہ کی آگ بجھ گئی اور تصوراتِ باطل کا زور ختم ہو گیا اور اس فتح و نصرت کا سہرا اس کے علم بردار اسد اللہ الغالب علیؑ ابن ابی طالبؑ کے سر ہے، بلکہ اس کتاب کے مطالعے میں جتنا جتنا میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا، میں نے مناظرے کی تبدیلی اور مواقف کے تغیر کو محسوس کیا کبھی میں اپنے کو ایسے عالم میں پاتا تھا جہاں معانی کی بلند روحیں خوش نما عبارتوں کے جامے پہنے ہوئے پاکیزہ نفوس کے گرد چکر لگاتی اور صاف دلوں کے نزدیک آکر انھیں سیدھے راستے پر چلنے کا اشارہ کرتی اور نفسانی خواہشوں کا قلع قمع کرتی اور لغزش مقامات سے متنفر بنا کر فضیلت وکمال کے راستوں کا سالک بناتی ہیں۔ اور کبھی ایسے جملے سامنے آجاتے ہیں جو معلوم ہوتا ہے کہ تیوریاں چڑھائے ہوئے اور

دانت نکالے ہوئے ہول ناک شکلوں میں آگے بڑھ رہے ہیں اور ایسی روحیں ہیں جو چیتوں کے پیکروں میں اور شکاری پرندوں کے پنجوں کے ساتھ حملے پر آمادہ ہیں اور ایک دم شکار پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور دلوں کو ان کے ہوا و ہوس کے مرکزوں سے جھپٹ کر لے جاتے ہیں اور ضمیروں کو پست جذبات سے زبردستی علٰحدہ کر دیتے اور غلط خواہشوں اور باطل عقیدوں کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ اور بعض اوقات میں جیسے مشاہدہ کرتا تھا کہ ایک نورانی عقل، جو جسمانی مخلوق سے کسی حیثیت سے بھی مشابہ نہیں ہے، خداوندی بارگاہ سے الگ ہوئی اور انسانی روح سے متصل ہوکر اسے طبیعت کے پردوں سے اور مادیت کے حجابوں سے نکال لیا اور اسے عالمِ ملکوت تک پہنچا دیا اور تجلیاتِ ربانی کے مرکز تک بلند کر دیا اور لے جا کر عالمِ قدس میں اس کو ساکن بنا دیا۔ اور بعض لحات میں معلوم ہوتا تھا کہ حکمت کا خطیب صاحبانِ اقتدار اور قوم کے اہلِ حل وعقد کو للکار رہا ہے اور انھیں صحیح راستے پر چلنے کی دعوت دے رہا ہے اور ان کی غلطیوں پر متنبہ کر رہا ہے اور انھیں سیاست کی باریکیاں اور تدبر و حکمت کے دقیق نکتے سمجھا رہا ہے اور ان کی صلاحیتوں کو حکومت کے منصب اور تدبر و سیاست کی اہلیت پیدا کر کے مکمل بنا رہا ہے۔

اس میں علامہ محمد عبدہ نے جس طرح یقینی طور پر اس کو کلامِ امیر المومنینؑ تسلیم کیا ہے، اسی طرح اس کے مضامین کی حقانیت اور اس کے مندرجات کی سچائی کا بھی اعتراف کیا ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اس کتاب کے مضامین حق کی فتح اور باطل کی شکست اور شکوک و اوہام کی فنا اور توہمات و وساوس کی بیخ کنی کا سبب ہیں اور وہ شروع سے آخر تک انسانی روح کے لیے روحانیت و طہارت اور جلال و کمال کی تعلیمات کے حامل ہیں۔

علامہ محمد عبدہ کو نہج البلاغہ سے اتنی عقیدت تھی کہ وہ اسے قرآن مجید کے بعد ہر کتاب کے مقابلے میں ترجیح کا مستحق سمجھتے تھے اور انھوں نے اپنا یہ اعتقاد بتایا ہے کہ جامعہٴ اسلامیہ میں اس کتاب کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونا اسلام کی ایک صحیح خدمت ہے اور یہ صرف اس لیے کہ وہ امیر المومنینؑ ایسے بلند مرتبہ مصلحِ عالم کا کلام ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

لیس فی اهل هذه اللغة الاقائل بأن کلام الامام علی ابن ابی طالب هو اشرف الکلام وابلغه۔ بعد کلام الله تعالیٰ و کلام نبیه و اغزره مادة وارفعه اسلوباً واجمعه لجلائل المعانی فاجد بالطالبین لنفائس اللغة والطامعین فی التدرج المراقیها ان یجعلو هذا الکتاب اهم محفوظهم و افضل مأثور هم مع تفهم معانیه فی الاغراض التی جاء ت لاجلها و تأمل الفاظه فی المعانی التی صیغت للدلالة علیها لیصیبوا بذالك افضل غایة ویتنوها الیٰ خیر نهایة۔

اس عربی زبان والوں میں کوئی ایسا نہیں جو اس کا قائل نہ ہو کہ امیر المومنینؑ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا کلام کلام خدا و کلام رسولؐ کے بعد ہر کلام سے بلند تر، زیادہ پرمعانی اور زیادہ فوائد کا حامل ہے، لہٰذا زبانِ عربی کے نفیس ذخیروں کے طلاب کے لیے یہ کتاب سب سے زیادہ مستحق ہے کہ وہ اسے اپنے محفوظات اور منقولات میں اہم درجے پر رکھیں اور اس کے ساتھ ان معانی و مقاصد کے سمجھنے کی کوشش کریں جو اس کتاب کے الفاظ میں مضمر ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ علامہ محمد عبدہ کی یہ کوشش پورے طور پر بار آور بھی ہوئی ایسے تنگ نظری کے ماحول میں جب کہ علمی دنیا کا یہ افسوس ناک رویہ ہے کہ خود اہلِ سنت کی وہ کتابیں جو اہلِ بیتِ معصومینؑ سے یا حضرتِ علیؑ ابن ابی طالبؑ سے متعلق ہیں، انھیں زیادہ تر ایران کے شیعی مطبعوں نے شائع کیا ہے مگر مصر و بیروت وغیرہ کے علمی مرکزوں نے انھیں کبھی قابل اشاعت نہ سمجھا۔ مثلاً سبطِ ابن جوزی کتبِ سیر میں پوری علمی جلالت سے یاد کیے گئے ہیں، مگر ان کی کتاب تذکرہ صرف اس لیے سوادِ اعظم کی بارگاہ میں درخورِ اعتناء نہیں سمجھی گئی کہ اس میں اہلِ بیتِ رسولؐ کے

حالات زیادہ ہیں اسی طرح حافظ نسائی کی خصائص وغیرہ، مگر نہج البلاغہ اپنے تمام مندرجات کے باوجود جن سے سوادِ اعظم کو اختلاف ہوسکتا ہے، پھر بھی مصر اور بیروت کے علمی حلقوں میں پوری پوری مقبولیت اور مرکزیت رکھتی ہے، اس کے مسلسل ایڈیشن شائع ہوتے ہیں اور مدارس اور یونی ورسٹیوں کے نصابوں میں داخل ہے۔ یہ صرف ہندوستان یا پاکستان کی مناظرانہ ذہنیت اور اس کی مسموم فضا ہے کہ یہاں کے مدارس میں اکثر اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جاتا ہے جو خالص شیعی کتاب سے ہونا چاہیے۔ علامہ شیخ محمد عبدہ نے نہ صرف اس کتاب پر حواشی لکھ دیے اور اسے طبع کر دیا بلکہ وہ اپنی گفتگوؤں میں برابر اس کی تبلیغ کرتے رہتے تھے، چنانچہ مجلۂ الہلال مصر نے اپنی جلد نمبر ۳۵ کے شمارۂ اول بابت نومبر ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۸۷ پر چار سوالات علمی طبقے کی توجہ کے لیے شائع کیے تھے جن میں پہلا سوال یہ تھا:

ماهو الكتاب اوالكتب التى طالعتموها فى شبابكم فافادتكم و كان لها اثر فى حياتكم۔

وہ کون سی کتاب یا کتابیں ہیں جن کا آپ نے دورِ شباب میں مطالعہ کیا تو انھوں نے آپ کو فائدہ پہنچایا اور ان کا آپ کی زندگی پر اثر پڑا؟

اس سوال کا جواب جو استاد شیخ مصطفی عبدالرزاق نے دیا ہے، وہ شمارۂ دوم بابت دسمبر ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۱۵۰ پر شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

طالعت بارشاد الاستاذ المرحوم الشيخ محمد عبده ديوان الحماسته و نهج البلاغة۔

میں نے استاد مرحوم شیخ محمد عبدہ کی ہدایت سے دیوان حماسہ اور نہج البلاغہ کا مطالعہ کیا۔

عبدالمسیح انطا کی نے بھی، جن کی رائے اس کے بعد آئے گی، اس کا ذکر کیا کہ علامہ محمد عبدہ نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ انشا پردازی کا درجہ حاصل کرو تو امیرالمومنینؑ حضرتِ علیؑ کو اپنا استاد بناؤ اور ان کے کلام کو اپنے لیے چراغِ ہدایت قرار دو۔

موصوف کا یہ عقیدہ نہج البلاغہ کے متعلق کہ وہ تمام و کمال امیرالمومنینؑ کا کلام ہے، اتنا نمایاں تھا کہ ان کے تمام شاگرد، جو ان کے بعد سے اب تک مصر کے بلند پایہ اساتذہ میں رہے، اس حقیقت سے واقف تھے۔ چنانچہ استاد محمد محی الدین عبدالحمید، مدرسِ کلیۂ نعتِ عربیہ جامعۂ ازہر، جن کے خود خیالات ان کی عبارت میں اس کے بعد پیش ہوں گے، اپنے شائع کردہ ایڈیشن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

عسيت ان تسائل رأى الاستاذ الامام الشيخ محمد عبده فى ذلك و هوالذى بعث الكتاب من مرقده ولم يكن احد اوسع منه اطلاعاً ولا ادق تفكير اوالجواب علىٰ هذا تساؤل ان نعتقد انه رحمه الله كان مقتنعاً بان الكتاب كله للامام على رحمه الله۔

ممکن ہے تم اس بارے میں استاد امام شیخ محمد عبدہ کی رائے دریافت کرنا چاہتے ہو جنھوں نے اس کتاب کو خوابِ گمنامی سے بیدار کیا اور ان سے بڑھ کر کوئی وسعتِ اطلاع اور باریکیِ نگاہ میں مانا بھی نہیں جا سکتا، تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو تمام و کمال امیرالمومنینؑ کا کلام سمجھتے تھے۔

علامہ محمد عبدہ کا یہ مقدمہ جس کے اقتباسات ہم نے درج کیے ہیں، خود دنیائے ادبیت میں کافی اہمیت رکھتا ہے، چنانچہ سید احمد ہاشمی نے اپنی کتاب جواہر الادب، حصۂ اول میں صفحہ ۳۱۷، ۳۱۸ پر اسے تمام و کمال درج کر دیا ہے اور اس پر عنوان قائم کیا ہے وصف نهج البلاغة للامام المرحوم الشيخ محمد عبده المتوفى ۱۳۲۲ھج۔

(۱۳) ملکِ عرب کے مشہور مصنف، خطیب اور انشاپرداز شیخ مصطفی غلائینی استاذ التفسير وانفقه ولاداب العربيه فى الكلية الاسلاميه بیروت، اپنی

کتاب اریج الزهر میں زیرِ عنوان نہج البلاغة واسالیب الکلام العربی ایک مبسوط مقالے کے تحت میں تحریر کرتے ہیں:

من احسن ما ینبغی مطالعة لمن یتطلب الاسلوب العالی کتاب نہج البلاغه للامام علی رضی الله عنه وهو الکتاب الذی انشأت هذا المقال لاجله فان فیه من بلیغ الکلام و الاسالیب المدهشة والمعانی الرائقة و مناحی الموضوعات الجلیلة ما یجعل مطالعه اذ ازاوله مزاولة صحیحة بلیغا فی کتابته و خطابتة و معانیه۔

بہترین چیز جس کا مطالعہ بلند معیارِ ادبی کے طلب گاروں کو لازم ہے، وہ امیرالمومنین علی علیہ السلام کی کتاب نہج البلاغہ ہے اور یہی وہ کتاب ہے جس کے لیے خاص طور پر یہ مقدمہ لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں بلیغ کلام اور ششدر کردینے والے طرزِ بیان اور خوش نما مضامین اور مختلف عظیم الشان مطالب ایسے ہیں کہ مطالعہ کرنے والا اگر ان کی صحیح مزاولت کرے تو وہ اپنی انشا پردازی، اپنی خطابت اور اپنی گفتگو میں بلاغت کے معیار پر پورا اتر سکتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے کثیر التعداد افراد بلکہ اقوام نے استفادہ کیا ہے جن میں سے ایک کاتبِ الحروف بھی ہے۔ میں ان تمام افراد کو جو عربی کے بلند اسلوبِ تحریر کے طالب اور کلام بلیغ کے جویا ہوں، اس کتاب کے حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

(۱۴) استاذ محمد کرد علی رئیس مجمع علمی دمشق نے "الہلال" کے چار سوالات کے جواب میں جن میں سے تیسرا سوال یہ تھا کہ ماهی الکتب التی تنصحون لشبان الیوم بقرأتها" وہ کون سی کتابیں ہیں جن کے پڑھنے کی موجودہ زمانے کے نوجوانوں کو آپ ہدایت کرتے ہیں؟" اس سوال کے جواب میں لکھا ہے:

اذا طلب البلاغة فی اتم مظاهر ها ولفصاحة التی لم تشبهها عجمة فعلیك بنهج البلاغة دیوان خطب امیرالمومنین علی بن ابی طالب و رسائله الیٰ عماله یرجع الیٰ فصل الانشاء والمنشئین فی کتابی۔

"القدیم والحدیث"

طبع بمصر ۱۹۲۵ء

اگر بلاغت کا اس کے مکمل ترین مظاہرات کے ساتھ مشاہدہ مطلوب ہو اور اس فصاحت کو جس میں ذرہ بھر بھی زبان کی کوتاہی شامل نہیں ہے، دیکھنا ہو تو تم کو نہج البلاغہ کا مطالعہ کرنا چاہیے جو امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالب کے خطب و مکاتیب کا مجموعہ ہے۔

تفصیل کے لیے ہماری کتاب "القدیم والحدیث" مطبوعہ مصر ۱۹۲۵ء فصل الانشاو المنشئون دیکھنا چاہیے۔

یہ جواب الہلال کی جلد نمبر پینتیس کے شمارہ نمبر ۵ بابت ماہِ مارچ، ۱۹۲۷ء میں صفحہ ۲۷۵ پر شائع ہوا ہے۔

(۱۵) استاذ محمد محی الدین المدرس فی کلیة اللغة العربیة بالجامع الازهر۔ جنھوں نے نہج البلاغہ پر تعلیمات تحریر کیے ہیں اور علامہ شیخ محمد عبدہ کے حواشی برقرار رکھتے ہوئے بہت سے تحقیقات وشرح کا اضافہ کیا ہے اور ان حواشی کے ساتھ یہ کتاب مطبع استقامۃ مصر میں طبع ہوئی ہے۔ انھوں نے اس ایڈیشن کے شروع میں اپنی جانب سے ایک مقدمہ بھی تحریر کیا ہے جس میں نہج البلاغہ کے استناد و اعتبار پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے ضروری اجزا یہاں درج کیے جاتے ہیں:

وبعد فهذا کتاب نہج البلاغة و هو ما اختاره الشریف الرضی ابوالحسن محمد بن الحسن الموسوی من کلام امیرالمومنین علی بن ابی

طالب الذی جمع بین دفتیه عیون البلاغة و فنونها و تهیائت به للناظر فیه اسباب الفصاحة و دنا منه قطافها اذ کان من کلام افصح الخلق بعد الرسول صلی الله علیه وسلم منطقا و اشدهم اقتدارا وابر عهم حجة و املکهم لغة یدیر ها کیف شاء الحکیم الذی تصدر الحکمة عن بیانه والخطیب الذی یملاء القلب سحر لسانه العالم الذی تهیا له من خلاط الرسول و کتابة الوحی والکفاح عن الدین بسیفه و لسانه منذحدا ثته مالم یتهیا لا حد سواه هذا کتاب نهج البلاغة وانا به حفی منذ طرائة السن و میعة الشباب فلقد کنت اجد والدی کثیر القرائة فیه و کنت اجد عمی الاکبر یقضی معه طویل الساعات یردد عباراته و یستخرج معانیها و یتقبل اسلوبه و کان لهما من عظیم التاثیر علی نفسی ما جعلنی اقفو اثر هما فاحله من قلبی المحل الاول واجعله سمیری الذی لا یمل وانیسی الذی اخلو الیه اذا عزا الانیس۔

یہ کتاب نہج البلاغہ امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کلام کا وہ انتخاب ہے جو شریف رضی ابوالحسن محمد بن حسن موسوی نے کیا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو اپنے دامن میں بلاغت کے نمایاں جوہر اور فصاحت کے بہترین مرقعے رکھتی ہے اور ایسا ہونا ہی چاہیے کیونکہ وہ ایسے شخص کا کلام ہے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام خلق میں سب سے زیادہ فصیح البیان، سب سے زیادہ قدرتِ کلام کا مالک اور قوتِ استدلال میں زیادہ اور الفاظِ لغتِ عربی پر سب سے زیادہ قابو رکھنے والا تھا کہ جس صورت سے چاہتا تھا، انھیں گردش دے دیتا تھا، اور وہ بلند مرتبہ حکیم جس کے بیان سے حکمت کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور وہ خطیب جس کی جادو بیانی دلوں کو بھر دیتی ہے۔ وہ عالم جس کے لیے پیغمبرِ خداؐ کے ساتھ انتہائی روابط اور وحی کی کتابت اور دین کی نصرت میں شمشیر و زبان دونوں سے جہاد کے ابتدائی عمر سے وہ مواقع حاصل ہوئے جو کسی دوسرے کو ان کے سوا حاصل نہیں ہوئے۔ یہ ہے کتابِ نہج البلاغہ! اور میں اپنے عنفوانِ شباب اور ابتدائے عمر ہی سے اس کا گرویدہ رہا ہوں، کیونکہ میں اپنے والد کو دیکھتا تھا کہ وہ اکثر اس کتاب کو پڑھتے تھے اور اپنے بڑے چچا کو بھی دیکھتا کہ وہ گھنٹوں پڑھتے رہتے، اس کے معانی کو سمجھتے رہتے اور اس کے اندازِ بیان پر غور کرتے رہتے۔ اور ان دونوں بزرگواروں کا میرے دل پر اتنا بڑا اثر تھا جس نے مجھے بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا اور میں نے اس کتاب کو اپنے قلب میں سب سے مقدم درجہ دے دیا، اسے اپنا مونس تنہائی قرار دیا جو ہمیشہ میرے لیے دل بستگی کا باعث ہے۔

اس کے بعد علامۂ مذکور نے ان اشخاص کا ذکر کیا ہے جن کا رجحان یہ ہے کہ وہ اسے شریف رضیؒ کا خود کلام قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیالات کا جائزہ لیتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں، کہتے ہیں کہ سب سے اہم اسباب جو اس کتاب کے کلام امیرالمومنینؑ نہ ہونے سے متعلق پیش کیے جاتے ہیں، صرف چار ہیں۔ پہلے یہ کہ اس میں اصحابِ رسولؐ کی نسبت ایسے تعریضات ہیں جن کا حضرتِ علی علیہ السلام سے صادر ہونا تسلیم نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً معاویہ، طلحہٰ، زبیر، عمرو بن عاص اور ان کے اتباع کے بارے میں سب وشتم تک موجود ہے۔ دوسرے اس میں لفظی آرائش اور عبارت میں صنعت گری اس حد پر ہے جو حضرتِ علی علیہ السلام کے زمانے میں مفقود تھی۔ تیسرے اس میں تشبیہات و استعارات اور واقعات و مناظر کی صورت کشی اتنی مکمل ہے جس کا پتہ صدرِ اسلام میں اور کہیں نہیں ملتا۔ اس کے ساتھ حکمت و فلسفہ کی اصطلاحیں اور مسائل کے بیان میں اعداد کا پیش کرنا، یہ باتیں اس زمانے میں رائج نہ تھیں۔ چوتھے اس کتاب کی اکثر عبارتوں سے علم غیب کے ادعا کا پتہ چلتا ہے جو حضرتِ علیؑ ایسے پاک باز انسان کی شان سے بعید ہے۔

موصوف ان خیالات کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

خدا گواہ ہے کہ ہمیں ان اسباب میں سے کسی ایک میں اور ان سب میں مجموعی طور پر بھی کوئی واقعی دلیل، بلکہ دلیل نما شکل بھی اس دعوے کے ثبوت میں نظر نہیں آتی جو ان لوگوں کا مدعا ہے، بلکہ انھیں تو ایسے شکوک وشبہات کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا جو کسی حقیقت کے ماننے میں تھوڑا سا دغدغہ بھی پیدا کر سکتے ہوں اور جن کے رفع کرنے کی ضرورت ہو، پھر انھوں نے ایک ایک کر کے ہر بات کو رد بھی کیا ہے۔ پہلی بات کے متعلق جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولؐ کے بعد مسئلۂ خلافت میں طرزِ عمل ہی ایسا اختیار کیا گیا جس سے فطرتاً حضرتِ علی علیہ السلام کو شکایت ہونا ہی چاہیے تھی اور آپ کی خلافت کے دور میں اہلِ شام نے آپ کے خلاف جو بغاوت کی، اس سے آپ کو تکلیف ہونا ہی چاہیے۔ ہر دور کے متعلق آپ کے جس طرح کے الفاظ ہیں، وہ بالکل تاریخی حالات کے مطابق ہیں، اس لیے اس میں شک وشبہ کا کیا محل ہے۔

دوسری اور تیسری دلیل کا جواب یہ ہے کہ حضرتِ علی ابنِ ابی طالب کا سا مرتبۂ فصاحت اور حکمت دونوں میں کسی اور شخص کو حاصل نہیں تھا، تو پھر آپ کے کلام کی خصوصیتیں اس دور میں کسی اور کے یہاں مل ہی کیونکر سکتی ہیں۔ رہ گیا سجع و قافیہ کا التزام، وہ آپ کے یہاں اس طرح نہیں جس سے آورد ظاہر ہو یا معانی پر اس کا اثر پڑے اور اس حد تک قافیہ وغیرہ کا التزام اس دور میں عموماً رائج تھا۔

چوتھی دلیل کے جواب میں علامۂ مذکور نے جو کہا ہے، وہ ہمارے مذہبی عقائد کے بے شک مطابق نہیں ہے، مگر وہ خود ان کے نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جسے علمِ غیب سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسے ہم فراست اور زمانے کی نبض شناسی کا نتیجہ سمجھتے ہیں جو علیؑ ایسے حکیم انسان سے بعید نہیں ہے جیسا کہ ہم نے کہا۔ یہ جواب انھوں نے مادی ذہنیت کے مطابق دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر خدا کے دیے ہوئے علمِ غیب کا مظاہرہ باعثِ انکار قرار دیا جائے تو اکثر احادیثِ نبویہ بھی اس زد میں آجائیں گی اور خدا کی طرف سے علمِ غیب کا مظاہرہ تو اکثر قرآن کی آیات سے نمودار ہی ہے، پھر قرآن کی آیتوں کا بھی انکار کرنا چاہیے۔ اور اگر علم الٰہی کی بنا پر ان آیات کو تسلیم کیا جائے تو اس کے عطا کردہ علم سے علیؑ ایسے عالمِ ربانی کے کلام میں اس طرح کی باتوں کے تذکرے پر بھی کسی حرف گیری کا موقع نہیں ہے۔

(۱۲) استاذ شیخ محمد حسن نائل المرصفی نے بھی نہج البلاغہ کی ایک شرح لکھی ہے جو دار الکتب العربیہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مقدمے میں **كلمة فى اللغته العربيه** کا عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں:

ولقد كان المجلى فى هذه الحلبة على صلوات الله عليه وما حسبنى احتاج فى اثبات هذا الى دليل اكثر من نهج البلاغة ذلك الكتاب الذى اقامه الله حجة واضحة على ان علياً رضى الله عنه قد كان احسن مثال حى لنور القرآن و حكمته و علمه و هدايته و اعجازه وفصاحته اجتمع لعلى عليه السلام فى هذا الكتاب ما لم يجتمع لكبار الحكماء وافذاذ الفلاسفة و نوابغ الربانيين من آيات الحكمة السامية و قواعد السياسة المستقيمة و من كل موعظة باهرة و حجة بالغة تشهد له بالفضل و حسن الاثر خاض على فى هذا الكتاب لجة العلم و السياسة والدين فكان فى كل هذه المسائل نابغة مبرزا۔

اس میدان میں سب سے آگے حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے اور اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت نہج البلاغہ ہے جسے اللہ نے ایک واضح حجت اس کی بنایا ہے کہ علیؑ ابن ابی طالبؑ قرآن کے نور اور حکمت اور علم اور ہدایت اور اعجاز اور فصاحت کی بہترین زندہ مثال تھے۔ اس میں حضرت علیؑ کی زبان سے اتنی چیزیں یکجا ہیں جو بڑے حکما اور یکتائے زمانہ فلاسفہ اور شہرۂ آفاق علمائے ربانیین، ان سب کی زبانی ملا کر بھی یکجا نہیں ملتیں۔ حکمت کی بلند نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد، حیرت خیز

موعظہ اور موثر استدلال اس کتاب میں علیؑ ابن ابی طالبؑ نے علمِ سیاست اور دین کے ہر دریا کی غواصی کی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ ان میں سے ہر شعبے میں یکتائے روزگار تھے۔

(۱۷) استاذ محمد الزہری الغمر اوی جنھوں نے مرصفی کی مذکورۂ بالا شرح پر ایک مقدمہ تحریر کیا ہے، اس میں طبقات الفصحا کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

ولم ينقل عن احد من اهل هذه الطبقات ما نقل عن امير المومنين على بن ابى طالب كرم الله وجهه فقد اشتملت مقالاته على المواعظ الزهدية والمناهج السياسية والزواجر الدينية والحكم النفيسه والاداب الخلقية والدرر التوحيدية و الاشارات الغيبية والردود على الخصوم والنصائح على وجه العموم و قد احتوى على غرر كلامه كرم الله وجهه كتاب نهج البلاغة الذى جمعه وهذبه ابو الحسن محمد بن طاهر المشهور بالشريف الرضى رحمه الله واثابه وارضاه۔

ان تمام طبقات کے لوگوں میں سے کسی ایک سے بھی وہ کارنامہ نقل ہو کر ہم تک نہیں پہنچا جو امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب کرم اللہ وجہہٗ کی زبانی پہنچا ہے۔ آپ کے مقالاتِ زاہدانہ مواعظ، سیاسی مسلک اور دینی ہدایات، نفیس فلسفی بیانات، اخلاقی تعلیمات، توحید کے جواہر، غیبی اشارات، مخالفین کی ردو قدح اور عمومی نصائح پر مشتمل ہیں اور آپ کے کلام کے روشن اقتباسات پر مشتمل کتاب نہج البلاغہ ہے جسے ابوالحسن محمد ابن طاہر مشہور بہ شریف رضی رحمہ اللہ نے جمع کیا ہے۔

(۱۸) **الاستاذ عبدالوهاب حموده استاذ الادب الحديث بكلية الآداب جامعه فواد الاول** مصر نے اپنے مقالے **الآرا الاجتماعيه فى نهج البلاغة** میں جو رسالۃ الاسلام قاہرہ کے جلد ۳، عدد ۳ بابت ماہِ رمضان ۱۳۷۰ھ، مطابق جولائی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ہے، لکھا ہے:

وقد اجتمع له رضى الله عنه فى كتاب نهج البلاغة ما يجتمع لكبار الحكماء وافذاذ الفلاسفة و نوابغ الربانيين من آيات الحكمة السامية، قواعد السياسة المستقيمة و من كل موعظة باهرة، و حجة بالغة وآراء اجتماعية، واسس حربية، مما يشهد للامام بالفضل وحسن الاثر۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی زبان سے کتاب نہج البلاغہ میں تن تنہا وہ تمام چیزیں اکٹھا ہوگئی ہیں جو اکابر علما اور یکتائے روزگار فلاسفہ اور سر برآوردہ علمائے ربانیین سے مجموعی طور پر یکجا کی جاسکتی ہیں۔ بلند حکمت کی نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد اور ہر طرح کا حیرت خیز موعظ اور موثر استدلال اور اجتماعی تصورات، یہ سب امیر المومنینؑ کی فضیلت اور بہترین کارگزاری کے بین گواہ ہیں۔

(۱۹) علامہ ابو نصر، پروفیسر بیروت یونی ورسٹی نے اپنی کتاب علیؑ ابن ابی طالبؑ کی فصل ۳۱ میں امیر المومنینؑ کے آثارِ عربی میں نہج البلاغہ کا ذکر کیا ہے اور اس ذیل میں لکھا ہے کہ یہ کتاب علیؑ ابن ابی طالبؑ کی عظیم شخصیت کی مظہر ہے۔

(۲۰) قاضی علی ابن محمد شوکانی صاحب نیل الاوطار نے اپنی کتاب **اتحاف الاكابر باسانيد الدفاتر**، طبع حیدرآباد (باب النون) میں نہج البلاغہ کے لیے اپنی سندِ متصل درج کرتے ہوئے لکھا ہے، **نهج البلاغه من كلام على رضى الله عنه**: ''یہ وہ حقیقت ہے جس کا متعدد عیسائی محققین نے بھی اعتراف کیا ہے''۔

(۱) عبدالمسیح انطا کی صاحب جریدۂ ''العمران'' مصر جنھوں نے امیر المومنینؑ کی سیرت میں اپنی مشہور کتاب ''شرحِ قصیدۂ علویہ'' تحریر کی ہے اور وہ مطبع رعمسیس فجالہ مصر میں شائع ہوئی ہے، وہ اس کے ص ۵۳۰ پر تحریر کرتے ہیں:

لا جدال ان سيدنا علياً امير المومنين هو امام الفصحاء و استاذ البلغاء واعظم من خطب

و کتب فی حرف اهل هذه الصناعة الالبآء وهذا کلام قد قیل فیهِ بحق انه فوق کلام الخلق و تحت کلام الخالق قال هذا کل من عرف فنون الکتابة واشتغل فی صناعة التحبیر والتحریر بل هو استاذ کتاب العرب و معلمهم بلامراء فما من ادیب لبیب حاول اتقان صناعة التحریر الاوبین یدیه القرآن و نهج البلاغة ذاك کلام الخالق و هذا کلام اشرف المخلوقین و علیهما یعول فی التحریر و تحبیراذا اراد ان یکون فی معاشر الکتبة المجیدین و لعل افضل من خدم لغة قریش الشریف الرضی الذی جمع خطب و اقوال و حکم ورسائل سیدنا امیرالمومنین من افواه الناس واما لیهم و اصاب کل الاصابة باطلاقه علیه اسم "نهج البلاغة" وما هذا الکتاب الاصراطها المستقیم لمن یحاول الوصول الیها من معاشر المتادبین۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ سیدنا حضرت علیؑ امیرالمومنینؑ فصیحوں کے امام اور بلیغوں کے استاد اور عربی زبان میں خطابت اور کتابت کرنے والوں میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت ہیں۔ اور یہ وہ کلام ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ یہ کلامِ خلق سے بالا اور خالقِ کلام سے نیچے ہے۔ یہ ہر اس شخص کا قول ہوگا جس نے انشا پردازی کے فنون سے واقفیت حاصل کی ہو اور تحریر کا مشغلہ رکھا ہو، بلکہ آپ بلا شبہ تمام عرب انشا پردازوں کے استاد اور معلم ہیں۔ کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو تحریر کے فن میں کمال حاصل کرنا چاہے مگر یہ کہ اس کے سامنے قرآن ہوگا اور نہج البلاغہ، کہ ایک خالق کا کلام ہے اور دوسرا اشرف المخلوقین کا اور انھیں پر اعتماد کرے گا ہر وہ شخص جو چاہے گا کہ اچھے لکھنے والوں میں اس کا شمار ہو۔ غالباً زبانِ عربی کی خدمت کرنے والوں میں سب سے بڑا درجہ شریف رضیؒ کا ہے جنھوں نے امیرالمومنینؑ کے یہ خطبے اور اقوال اور حکیمانہ ارشادات اور خطوط لوگوں کے محفوظات اور مخطوطات سے یکجا کیے ہیں اور انھوں نے اس کا نام "نہج البلاغہ" بھی بہت ٹھیک رکھا۔ بلا شبہ یہ بلاغت کا صراطِ مستقیم ہے ہر اس شخص کے لیے جو اس منزل تک پہنچنا چاہے۔

اس کے بعد انھوں نے شیخ محمد عبدہ کی رائے بیان کی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے کہ ایک مرتبہ شیخ ابراہیم یازجی نے، جو اس آخری دور میں متفقہ طور پر عربی کے کامل انشا پرداز اور امامِ اساتذۂ لغت مانے گئے ہیں، مجھ سے فرمایا کہ مجھے اس فن میں جو مہارت حاصل ہوئی ہے، وہ صرف قرآنِ مجید اور نہج البلاغہ کے مطالعے سے۔ یہ دونوں عربی زبان کے وہ خزانۂ عامرہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔

(۲) فواد افراہم البستانی، استاذ الآداب العربیہ فی کلیۃ القدیس یوسف (بیروت)۔ انھوں نے ایک سلسلہ تعلیمی کتابوں کا روائع کے نام سے شروع کیا ہے جس میں مختلف جلیل المرتبہ مصنفین کے آثارِ قلمی اور تصانیف سے مختصر انتخابات مصنف کے حالات، کمالات، ، کتاب کی تاریخی تحقیقات وغیرہ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی صورت میں ترتیب دیے ہیں اور وہ کیتھلک عیسائی پریس (بیروت) میں شائع ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا مجموعہ امیرالمومنینؑ اور نہج البلاغہ سے متعلق ہے جس کے بارے میں مولف نے اپنے مقدمے میں تحریر کیا ہے:

اننا نبدأ الیوم بنشر منتخبات من نهج البلاغة للامام علی ابن ابی طالب اول مفکری الاسلام۔

ہم سب سے پہلے اس سلسلے کی ابتدا کرتے ہیں کچھ انتخابات کے ساتھ نہج البلاغہ کے جو اسلام کے سب سے پہلے مفکرِ امام علیؑ ابن ابی طالب کی کتاب ہے۔

اس کے بعد وہ سلسلہ شروع ہوا ہے جو سلسلۂ روائع کی پہلی قسط ہے۔ اس کا پہلا عنوان ہے "علیؑ ابن ابی طالب" جس کے

مختلف عناوین کے تحت میں امیر المومنینؑ کی سیرت اور حضرت کے خصوصیاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے جو ایک عیسائی کی تحریر ہوتے ہوئے پورے طور سے شیعی نقطۂ نظر کے موافق نہ سہی، لیکن پھر بھی حقیقت و انصاف کے بہت سے جوہر اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ دوسرا عنوان ہے ''نہج البلاغۃ'' اور اس کے ذیلی عناوین میں ایک عنوان ہے ''جمعۃ''، دوسرا عنوان ہے ''صحۃ نسبتہٖ''۔ اس کے تحت میں لکھا ہے: ''نہج البلاغہ کے جمع و تالیف کو بہت زمانہ نہیں گزرا تھا کہ بعض اہلِ نظر اور مورخین نے اس کی صحت میں شک کرنا شروع کیا۔ ان کا پیشرو ابنِ خلکان ہے جس نے اس کتاب کو اس کے جامع کی طرف منسوب کیا ہے اور پھر صفدی وغیرہ نے اس کی پیروی کی اور پھر شریف رضیؒ کے بسا اوقات اپنے دادا مرتضیٰ کے لقب سے یاد کیے جانے کی وجہ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہو گیا اور وہ ان میں اور ان کے بھائی علی بن طاہر معروف بہ سید مرتضیٰ، متولد ۹۶۶ء، متوفی ۱۰۴۴ء میں تفرقہ نہ سمجھ سکے اور انھوں نے نہج البلاغہ کے جمع کو ثانی الذکر کی طرف منسوب کر دیا جیسا کہ جرجی زیدان نے کیا ہے۔ اور بعض لوگوں نے جیسے مستشرق کلیمان نے یہ طرہ کیا کہ اصل مصنف کتاب کا سید مرتضیٰؒ ہی کو قرار دے دیا۔ ہم جب اس شک کے وجوہ و اسباب پر غور کرتے ہیں تو وہ ہر پھر کے پانچ امر ہوتے ہیں''۔

اس کے بعد انھوں نے شک کے وہی اسباب تقریباً تحریر کیے ہیں جو اس کے پہلے محی الدین عبدالحمید شارحِ نہج البلاغہ کے بیان میں گزر چکے ہیں اور پھر انھوں نے ان وجوہ کو رد کیا ہے۔

(۳) بیروت کے شہرۂ آفاق مسیحی ادیب اور شاعر پولس سلامہ اپنی کتاب ''اول ملحمہ عربیہ عید الغدیر'' میں جو مطبعۃ النسر، بیروت میں شائع ہوئی ہے، صفحہ ۱۷، ۲۷ پر لکھتے ہیں: ''نہج البلاغہ مشہور ترین کتاب ہے جس میں امام علی علیہ السلام کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کتاب سے بالاتر سوا قرآن کے اور کسی کتاب کی بلاغت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد حسبِ ذیل اشعار نہج البلاغہ کی مدح میں درج کیے گئے ہیں:

هذه الکهف للمعارف باب
مشرع من مدینه الاسرار
تنثر الدر فی کتاب مبین
سفر نهج البلاغة المختار
هو روض من کل زهر جنی
اطلعته السماء فی نوار
فیه من نضرة الورد العذاری
والخزامی والفد و الجلنار
فی صفاء الینبوع یجری زلالا
کوثر ارائقا بعید القرار
تلمع الشط والصفاف ولکن
بالعجز العیون فی الاغوار

یہ معارف و علوم کا مرکز اور اسرار و رموز کا کھلا ہوا دروازہ ہے۔ یہ نہج البلاغہ کیا ہے؟ ایک روشن کتاب میں بکھرے ہوئے موتی۔ یہ چنے ہوئے پھولوں کا ایک باغ ہے جس میں پھولوں کی لطافت، چشموں کی صفائی اور آبِ کوثر کی شیرینی، نہر کی وسعت اور کنارے تو آنکھوں سے نظر آتے ہیں مگر تہ تک نظریں پہنچنے سے قاصر ہیں''۔

مذکورۂ بالا ادبائے محدثین کے کلام سے نہج البلاغہ کی لفظی اور معنوی اہمیت بھی ضمناً ثابت ہو گئی ہے۔ اب اس کے متعلق مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اب رہ گیا ہمارے فنی اصول سے اس کتاب کا وہ درجہ جس اعتبار سے ہم اس سے استدلال کر سکتے ہیں، تو مجموعی طور پر ہمارے نزدیک اس کتاب کے مندرجات کی نسبت امیر المومنینؑ کی جانب اسی حد تک ثابت ہے جیسے صحیفۂ کاملہ کی نسبت امام زین العابدینؑ کی جانب یا کتبِ اربعہ کی نسبت ان کے مصنفین کی طرف یا معلقاتِ سبعہ کی نسبت ان کے نظم کرنے والوں کی جانب۔ رہ گیا خصوصی عبارات اور الفاظ میں سے ہر ایک کی نسبت اطمینان، وہ اسلوبِ کلام اور اندازِ بیان سے وابستہ ہے اور

ان مندرجات کے مطابقت کے اعتبار سے ہے ان ماخذوں کے ساتھ جو صحیح طور پر ہمارے یہاں مسلم الثبوت ہیں۔ اصطلاحی حیثیت سے قدما کی تعریف کے مطابق جو صحتِ خبر کے لیے وثوق بالصدور کو کافی سمجھتے ہیں، ان شرائط کے بعد اس کا ہر جز صحیح کی تعریف میں داخل ہے۔ اور متاخرین کی اصطلاح کے مطابق جو صحت کو باعتبارِ صفاتِ راوی قرار دیتے ہیں، نہج البلاغہ کے مندرجات کو مرسلات کی حیثیت حاصل ہے۔ مرسلات کی اہمیت ارسال کرنے والے کی شخصیت کے اعتبار سے ہوتی ہے، یہاں تک کہ ابن ابی عمیر اور بعض جلیل القدر اصحاب کے بارے میں علماء نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ ان تک جب خبر کی صحت ثابت ہو جائے تو پھر ان کے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کون راوی ہے، اس لیے کہ ان کا نقل کرنا خود اس کے اعتبار کی دلیل ہے اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ مرسلات ابن ابی عمیر حکم مسند میں ہیں۔ اس بنا پر خود جناب سید رضی اعلی اللہ مقامہٗ کی جلالتِ قدر ضرور اسے عام مرسلات سے ممتاز کر دیتی ہیں، پھر بھی مواعظ وتواریخ وغیرہ کا ذکر نہیں جس میں عقیدہ وعمل ایسی اہمیت نہیں ہے۔ لیکن مقامِ اعتقاد وعمل میں ہم نہج البلاغہ کے مندرجات کو اور ادلہ کے ساتھ، جو اس باب میں موجود ہوں، اصولِ تعادل وتراجیح کے معیار پر جانچیں گے اور بعض موقعوں پر ممکن ہے جو مسند حدیث اس موضوع میں موجود ہوں، اس پر نہج البلاغہ کی روایت کو ترجیح ہو جائے اور بعض مقاموں پر ممکن ہے تکافؤ ہو جائے اور بعض جگہ شاید ان دوسرے ادلہ کو ترجیح ہو جائے، لیکن اس سے نہج البلاغہ کی مجموعی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کا وزن اسی طرح برقرار رہتا ہے جس طرح کافی کی بعض حدیثوں کو کسی وجہ سے نظر انداز کرنے کے بعد بھی کافی کا وزن مسلم ہے۔

بہرصورت نہج البلاغہ کی علمی وادبی ومذہبی اہمیت اور اس کے حقائق آگیں مضامین اور اخلاقی مواعظ کا وزن ناقابلِ انکار ہے، مگر ظاہر ہے کہ نہج البلاغہ سے صحیح فائدہ وہی افراد اٹھا سکتے ہیں جو عربی زبان میں مہارت رکھتے ہوں۔ غیر عربی داں اس خزینۂ عامرہ سے فیض حاصل کرنے سے قاصر ہیں، اسی لیے ایرانی فضلا وعلماء کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اس کے فارسی ترجمے شائع کریں، چنانچہ متعدد ترجمے ایران میں اس کے شائع ہوتے رہے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اردو زبان میں ابھی تک نہج البلاغہ کا کوئی قابلِ اطمینان ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ بعض ترجمے جو شائع ہوئے، ان میں سے کسی میں اغلاط بہت زیادہ تھے اور کسی میں عبارت آرائی نے ترجمے کے حدود کو باقی نہیں رکھا، نیز حواشی میں کبھی خالص مناظرانہ انداز کی بہتات ہوگئی اور کبھی اختصار کی شدت نے ضروری مطالب نظر انداز کر دیے۔ جناب مولانا مفتی جعفر حسین صاحب جو ہندوستان و پاکستان میں کسی تعارف کے محتاج نہیں اور اپنے علمی کمالات کے ساتھ بلند سیرت اور سادگیِ معاشرت میں جن کی ذات ہندوستان اور پاکستان میں ایک مثالی حیثیت رکھتی ہے، ان کی یہ کوشش نہایت قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے اس کتاب کے مکمل ترجمے اور شارحانہ حواشی کے تحریر کا بیڑا اٹھایا اور کافی محنت وعرق ریزی سے اس کام کی تکمیل فرمائی۔ بغیر کسی شک وشبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک ہماری زبان میں جتنے ترجمے اس کتاب کے اور حواشی شائع ہوئے ہیں، ان سب میں اس ترجمے کا مرتبہ اپنی صحت اور سلاست اور حسنِ اسلوب میں یقینا بلند ہے اور حواشی میں بھی ضروری مطالب کے بیان میں کمی نہیں کی گئی اور زوائد کے درج کرنے سے احتراز کیا ہے۔ بلاشبہ نہج البلاغہ کے ضروری مندرجات اور اہم نکات پر مطلع کرنے کے لیے اس تالیف نے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس پر مصنفِ ممدوح قابلِ مبارک باد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ صاحبانِ ذوق ہر طبقے کے اس کتاب کا ویسا ہی خیر مقدم کریں گے جس کی وہ مستحق ہے۔ جزی اللہ مؤلفہ فی الدارین خیرا۔

❁❁❁